راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

مارچ 2016ء

گورنمنٹ ڈگری کالج میاں چنوں کے زیر اہتمام

نامور شاعر احسان شاہد کے شعری مجموعے "رہتا ہے میرے ساتھ" کی خوبصورت تقریب رونمائی

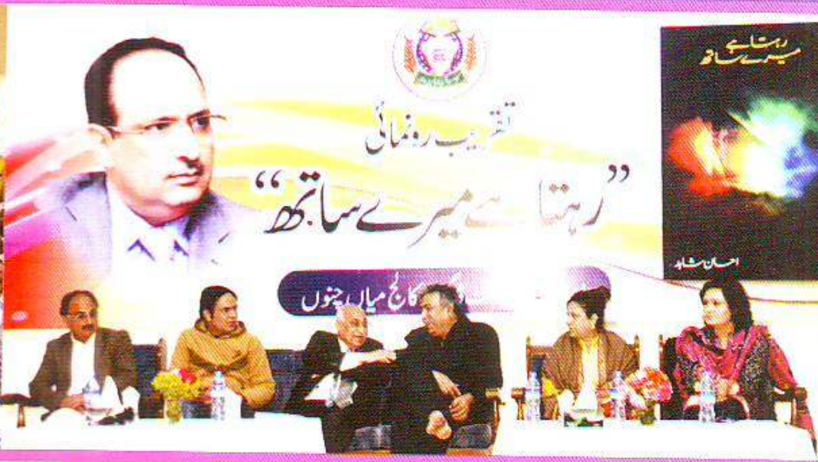

دائیں طرف سے ڈاکٹر صغرا صدف، صوفیہ بیدار، منظور آفاق، ڈاکٹر طاہر تونسوی، نبیل نجم

تقریب رونمائی میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے افراد کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

احسان شاہد

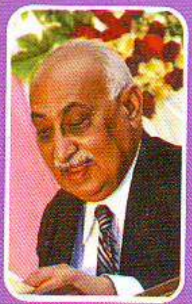

ڈاکٹر طاہر تونسوی

ڈاکٹر صغرا صدف

منصور آفاق

صوفیہ بیدار

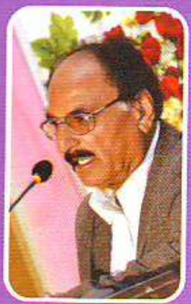

پرنسپل مہر یعقوب

رانا بابر حسین پارلیمانی سیکرٹری خزانہ

احسان شاہد اپنی کتاب پیش کرتے

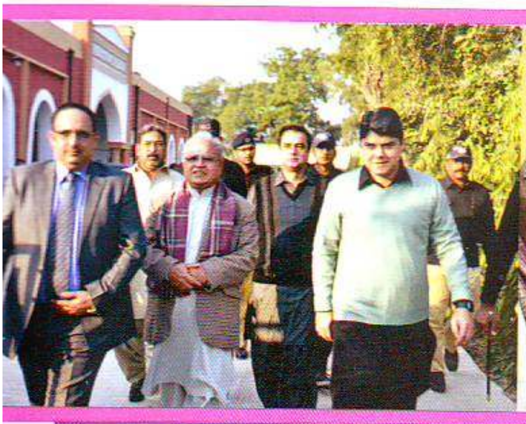

DPO خانیوال جہانزیب خان و دیگر مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے

رپورٹ: لیاقت علی منہاس

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر ۱۷ • جنوری 2016ء • شمارہ نمبر 11

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

مدیران اعزازی ⊙ ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

نائب مدیران ⊙ قمر ریاض (سعودیہ) ⊙ نازاو کاڑوی

مدیران معاون ⊙ صائمہ ملک (اسپین) ⊙ ادریس لاہوری (ناروے)

مدیر نظم ⊙ زاہد محمود شمس

مجلس مشاورت ⊙ محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ⊙ ظفر خان (امریکا)

قانونی مشیر ⊙ افتخار شوکت چوہدری (ایڈووکیٹ ہائیکورٹ) 0321-6012211

ارژنگ دوست ⊙ ارشد نذیر ساحل (اسپین) ⊙ آغا تنویر (کراچی)

کمپوزنگ ⊙ زریاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ⊙ نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الکریم سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0300-4489310 - 0331-4489310

فہرست

اداریہ ۲

حمد و نعت / گوہر ملیسانی، فرخ راجا، قمر حجازی، مظفر حسن منصور، خورشید بیگ میلسوی، غضنفر عباس سید، زاہد محمود شمس، ریاض ندیم نیازی ۳-۴

مضامین: ○ بارشوں کا موسم / ایوب خاور، ۵-۶

○ تمہارا رہنا سیکھ لیا ہے / اصفیہ حیات ۷-۸

○ وحید قندیل کی مونالیزا / تسنیم کوثر ۹-۱۰

○ ادبی و ثقافتی میلہ ۲۰۱۵ / ڈاکٹر عائشہ عظیم ۱۱

○ نوبل انعام یافتگان کا ترک وطن / عامر بن علی ۱۲

طنز و مزاح: ○ بچاؤ بچاؤ کا شور اور کانوں پر مظفر / حافظ مظفر محسن ۱۳-۱۴

شاعری: ۱۵-۱۹

آپ بیتی: شام و سحر کے درمیاں / رئیس عباس زیدی ۲۰-۲۲

میری کہانیاں:

○ پانچ منٹ، بات تو کچھ بھی نہیں، ڈیسنٹ / فوزیہ بھٹی ۲۳-۳۰

پنجاب رنگ: گوشہ / خورشید مستانہ ۳۱

شعری گوشے: حسین مجروح، خالد عرفان، طارق محمود طارق، سید سعید نقوی، انور ندیم ۳۲-۳۶

خاکہ: حسین اختر جلیل / فرخ راجا ۳۷-۳۹

انشائیہ: بھولے لوگ / پنجابی: عاشق رحیل، اردو: نازاو کاڑوی ۴۰-۴۱

بقیہ انٹرویو: ارشد شاہین ۴۲-۴۳

مختصر ادبی خبریں ۴۴

تبصرۂ کتب / فلیپ / آراء ۴۵-۵۰

نامہ ہائے احباب ۵۱-۵۲

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

اداریہ

ایک ایک کر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے
ہائے کیا لوگ مرے حلقۂ احباب میں تھے

گذشتہ چند ماہ میں آسمانِ ادب کے کیسے کیسے روشن چاند ستارے دیکھتے ہی دیکھتے ڈوبتے چلے گئے۔ عبداللہ حسین کی وفات کا صدمہ ابھی تازہ تھا کہ انتظار حسین بھی دارِ فانی سے چل بسے، نسرین انجم بھٹی داغِ مفارقت دے گئیں۔ ثریا بجیا کا انتقال بھی کسی سانحے سے کم نہیں۔ انڈیا سے ندا فاضلی اور ماہنامہ "ذہن جدید" کے مدیر زبیر رضوی کی وفات کی خبر سے بھی ادبی دُنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ لاہور میں معروف شاعر مختار جاوید اور ملتان میں ممتاز شاعر عارف منصور انتقال کر گئے۔ چند روز قبل امجد اسلام امجد کے والد بھی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جہانِ ادب کی نابغۂ روزگار ہستیاں اپنے ادبی کام کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ گزشتہ دو دہائیوں میں اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، منیر نیازی، قتیل شفائی، جون ایلیا، شہزاد احمد اور خالد احمد ہم میں نہیں رہے۔ یقیناً ایسے اور بھی کچھ نام ہیں۔ ربّ العزت! ان سب ہستیوں کے درجات بلند فرمائے، اپنی ایک نظم بچھڑنے والوں کی یاد میں قارئین کی نذر......

بچھڑنے والوں کے نام

وہ جو اس دھرتی پر چاند ستارے آئے تھے — وہ جو اپنے موسم اپنے ساتھ ہی لائے تھے
جن کی اپنی دھوپ تھی جن کے اپنے سائے تھے — وہ جو اہلِ علم تھے وہ جو صاحب رائے تھے
جن کی آہستہ قدمی سے وقت نہ پایا جیت
اُن کی یاد میں کوئی آنسو درد بھرا اک گیت

وہ جو ہم کو جینے کے آداب سکھاتے تھے — وہ جو ہم کو اُنگلی پکڑ کر ساتھ چلاتے تھے
وہ جو ہم کو خواب دکھاتے شعر سُناتے تھے — وہ جو سخت دلوں کو نرم گداز بناتے تھے
سچے جن کے وعدے تھے سب سچی جن کی پریت
اُن کی یاد میں کوئی آنسو درد بھرا اک گیت

جن کی باتیں جن کے ہونٹ دُعاؤں جیسے تھے — وہ جو چھاؤں میں دھوپ اور دھوپ میں چھاؤں جیسے تھے
وہ جو حبس کی رُت میں سرد ہواؤں جیسے تھے — اس سے پہلے دن برسے یہ ساون جائے بیت
اُن کی یاد میں کوئی آنسو درد بھرا اک گیت

حسن عباسی

حمد و نعت

اس گلشنِ حیات کی نزہت تو آپؐ ہیں
پھر مشکلاتِ دہر کی رحمت تو آپؐ ہیں
اہلِ قلم، ادیب بھی شاعر بھی سوچ لیں
علمِ لدنی آپؐ ہیں حکمت تو آپؐ ہیں

میرے آقاؐ نے پیغام ہے یہ دیا
ہو کے داخل رہو پورے اسلام میں
جان دے دو رہِ حق میں اے دوستو!
پاؤ گلزارِ جنت بھی انعام میں

کون سا عقدۂ دہر وا نہ ہوا
کون سا حقِ اُمت ادا نہ ہوا
ہر قدم، ہر گھڑی آرزو یہ رہی
کون سا عہد تھا جو وفا نہ ہوا
زندگی جب موقعِ تھی آلام کی
ہادیِ دو جہاںؐ کی تھی بعثت ہوئی
پھر مٹائے نشاناتِ ظلم و ستم
ہر طرف بارشِ لطف و رحمت ہوئی

سیدِ محترمؐ پہ سخن وار دوں
زندگی وار دوں بانکپن وار دوں
پھر بھی سوچوں تصدق تو کچھ نہ کیا
محسنِ کردار پہ جان و تن وار دوں

ربِّ عالم صلوٰۃ کہتا ہے
سب فرشتے سلام پڑھتے ہیں
اہلِ دنیا یہ سوچ لیں گوہرؔ
کتنے ان کا کلام پڑھتے ہیں

نامِ احمدؐ درخشاں ہے قرآن میں
طاعتِ مصطفیؐ بھی ہو ایمان میں
اہلِ الحاد کی سرکشی کے لیے
فکرِ خیر الوریٰؐ بھی ہو انسان میں

ان کے فقر و غنا کا مت پوچھو
ان کے جوشِ عطا کا مت پوچھو
اپنے دامن کی وسعتیں دیکھو
ان کے حسنِ ادا کا مت پوچھو

گوہر ملسیانی/خانیوال

یہ نور بار سفر ہے ذرا سنبھل کے چل
صراطِ اہلِ نظر ہے ذرا سنبھل کے چل
مسافروں میں فرشتے بھی ہیں پیمبر بھی
لطیف راہ گزر ہے ذرا سنبھل کے چل
دلیلِ کم نظری سے گریز کر مرے دل!
وہ کائنات خبر ہے ذرا سنبھل کے چل
جلیں فرشتوں کے پَر جس جگہ ہے اس کا مقام
وہ کیسے تجھ سا بشر ہے! ذرا سنبھل کے چل
وہاں پہ نور مجسم ہوئے ہیں اہلِ کسا
فلک مقام وہ گھر ہے ذرا سنبھل کے چل
نہیں ہے عشق اگر ان کی ذاتِ اقدس سے
عمل فریبِ نظر ہے ذرا سنبھل کے چل
اگر تو خیر کا طالب ہے سر جھکانا سیکھ
غرور باعثِ شر ہے ذرا سنبھل کے چل

فرخ راجا/جوہر آباد

جو بھی آیا، مرے حضورؐ کا ہے
جو بنایا، مرے حضورؐ کا ہے
خوف کیوں ہو نشور کے دن کا
مجھ پہ سایہ، مرے حضورؐ کا ہے
محترم وہ کھجور کا پودا
جو لگایا، مرے حضورؐ کا ہے
ہے وہی تو نجات کا رستہ
جو بتایا، مرے حضورؐ کا ہے
چومتا ہوں تبھی مدینہ کو
یہ بسایا، مرے حضورؐ کا ہے
جو ملا، وہ ملا وسیلے سے
جو بھی کھایا، مرے حضورؐ کا ہے
چل کے جائے قمرؔ مدینے وہ
جو بلایا، مرے حضورؐ کا ہے

قمر حجازی/اوکاڑا

ایمان و آگہی کا خلاصہ تمہیں تو ہو
رحمت کا باب، فیض کا چشمہ تمہیں تو ہو

حمد و نعت

جانِ بتولؓ و نازِ خدیجہؓ تمہیں تو ہو
زورِ علیؓ و جعفرؓ و حمزہؓ تمہیں تو ہو

جس کا بدل نہیں وہ محبت ہے آپؐ کی
جس کی قضا نہیں وہ فریضہ تمہیں تو ہو

وردِ درودِ پاک سے ٹلتی ہیں مشکلیں
ہم بیکسوں کے درد کا حیلہ تمہیں تو ہو

محوِ دُعا اویسؓ ہیں اُمّت کے واسطے
یہ جانتے ہوئے کہ وسیلہ تمہیں تو ہو

حاکم ہے کون حاجب و دربان کے بغیر
میری نظر میں شاہِ مدینہ تمہیں تو ہو

کرتے ہیں پیش عرضِ نیاز آپؐ کے حضور
اہلِ نظر کا قبلہ و کعبہ تمہیں تو ہو

تم حرفِ کُن کا معجزہ تم وجہِ کائنات
قرآن میں ہے جس کا قصیدہ تمہیں تو ہو

نادم ہے اشکبار ہے عصیاں گزیدہ ہے
منصور کو ہے جس پہ بھروسہ تمہیں تو ہو

مظفر حسن منصور/ جوہر آباد

گلاب و سرو سمن سب عطائے ربِّ جلیل
یہ خارزار و چمن سب عطائے ربِّ جلیل

اُسی کے دستِ ہنر کا کمال ہفت افلاک
یہ دشت و کوہ و دمن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ عرش و کرسی و لوح و قلم، یہ حرف و بیاں
یہ فکر و فن، یہ سخن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ مشک و عنبر و ریحاں، یہ لُولُو و مرجاں
عقیق و لعلِ یمن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ فاختہ یہ کبوتر، یہ باز یہ چڑیاں
یہ عندلیب چمن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ نطق و لب، یہ شعور و خیال و ذہن و خرد
زبان و قلب و دہن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ کہکشائیں، یہ مہتاب و انجم و خورشید
یہ خاکداں، یہ گگن سب عطائے ربِّ جلیل

خورشید بیگ میلسوی/ میلسی

صبحوں میں ترا حُسن و تجلی میرے اللہ
راتیں تیری عظمت کا مجلّہ میرے اللہ

اذہان و سماعت میں گہر بار اذانیں
سوچیں تیری رحمت سے مطلا میرے اللہ

وجدان میں نیت کی ہیں پرکیف نمازیں
بے تابیِ دل کا ہے مصلّا میرے اللہ

ہر جور پہ حاوی ہیں ترے فضل کے سائے
ہر ظلم پہ بھاری ترا پلہ میرے اللہ

کب سے تری مخلوق پہ ظلم اس کے ہیں جاری
شیطاں پہ ذرا بول دے ہلہ میرے اللہ

ہر شے ہی ترے لطفِ فراواں کی ہے مظہر
لیکن بنو ہاشم کا محلّہ میرے اللہ!

بھیجی ہے مجھے عرشِ معلیٰ سے غضنفر
یہ حمد بہ اُردوئے معلیٰ میرے اللہ

غضنفر عباس سید/ ساہیوال

شمعِ توحید کی سرکار جلانے آئے
یعنی ظلمات کا ہر نقش مٹانے آئے

میں نے ہونا تھا محمدؐ کا سو میں ہو بھی چکا
ایسے بے کار میں دنیا مجھے پانے آئے

جب بھی دھتکار کے دنیا مجھے تنہا کر دے
آپؐ کی یاد مجھے دل سے لگانے آئے

نعت کہنا تھا ''کہا'' صلی علیٰ سیدنا
لفظ یک دم لیے نعتوں کے خزانے آئے

آپؐ ہی تو شبِ یلدا کے قفس سے آخر
صبحِ بے تاب کو آزاد کرانے آئے

کون سی خلق ہے طیبہ جو نہ آتی ہو گی
ہر کوئی دل کی یہاں پیاس بجھانے آئے

کاش سو جاؤں انہیں یاد میں کرتے ہوئے شمس
اور طیبہ کی ہوا مجھ کو جگانے آئے

زاہد محمود شمس/ ملتان

بلاوا آپؐ کا میرے لئے احسان جیسا تھا
کہ پیغامِ صبا بھی، آپ کے فرمان جیسا تھا

مری قسمت ہوئی روشن، مدینے مجھ کو لے آیا
کہ بس جذبہ کوئی دل میں، مرے ایمان جیسا تھا

وہ کعبے کے مناظر اور مظاہرہ مدینے کے
مرا سارا وجود اک دیدۂ حیران جیسا تھا

ندیم انؐ کے کرم سے معنویت ایسی ہے فن میں
مرا ہر شعر گویا نعت کے دیوان جیسا تھا

ریاض ندیم نیازی/ سبی

بارشوں کا موسم

ایوب خاور/لاہور

عجیب بات ہے کہ جب بھی خواتین کی شاعری کے بارے میں کوئی بات ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے میرے ذہن میں پروین شاکر کا نام روشن ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے سے ہی میری ساتھی تھی بلکہ دوست بھی۔ ہم دونوں نے مل کر کراچی کے بین الکلیاتی مشاعروں اور ریڈیو پاکستان کراچی کے بزم طلبہ کے پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بلکہ اس لئے کہ پروین نے اپنے شعری سفر کے ابتدائی چند سالوں میں شعور ذات کی منڈیر سے اس طرف سے جن منظروں کو دیکھا، کلاسیکی ادب میں ان منظروں اور خواہشوں کا بیان مرد شعراء نے اپنے اپنے ڈھنگ سے کیا تو سہی لیکن محبوب کا جو کردار مجموعی طور پر ہماری شعری تاریخ میں ابھرا اور پروان چڑھا وہ ہمیں بتاتا ہے کہ محبوب خود سر، خود پسند، رقیب کے قریب رہ کر اپنے عاشق کا دل جلانے کے علاوہ کچھ نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ عاشق کے مرنے کی اطلاع پر اس کا دل پسیج جاتا ہے اور بس۔

مگر فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید نے اس محبوب کو ذرا کچھ اور ڈھنگ سے دیکھا۔ اس کے عورت پن میں اس کی اپنی خواہشوں کے اظہار اور اس کے اپنے وجود کے ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ سوشل ٹیبوز کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ بھی دیا، لیکن پروین نے ''خوشبو'' میں جو لڑکی اسکیچ کی ہے وہ در اصل کلاسیکی شاعری میں عشوہ و ناز و ادا سے ڈھکی ہوئی وہی لڑکی ہے جو اپنی خود پسندی کے خول سے نکل کر اپنی محبت کے سچے اور کھرے اظہار سے مرد شعراء کو چونکا گئی۔

یہ لڑکی جو پروین کے وجود سے نکل کر خوشبو کے اوراق میں پھیل گئی تھی، اس نے بعد میں آنے والی شاعرات کو حوصلہ دیا اور انہوں نے بھی اپنے قید جذبوں کو جگنوؤں کی طرح آزاد کیا اور اپنی اپنی کتابوں کے اوراق میں سجا دیا۔ ان کئی قابل ذکر خواتین میں ایک لبنیٰ صفدر بھی ہیں۔ جو بہت کم عرصے میں تین کتابیں لکھ چکی ہیں جن میں ''تمہیں تو میرا ہونا تھا'' ''محبت آئینہ کر لو'' ہجر ہے یا وصال ہے'' شامل ہے۔

آپ نے ان شعری مجموعوں کے ٹائٹلز پر غور کیا؟ کم نظر قاری کا بھی دل چاہے گا کہ ان خوبصورت اور دلکش ناموں والے شعری مجموعوں کو اگر پڑھ نہ بھی سکے تو ایک بار چھو ضرور لے۔ اس لئے کہ یہ نام ایک لڑکی کی کتابوں کے ہیں۔

گذشتہ بیس پچیس برسوں میں شعری دنیا میں نمایاں ہونے والی خواتین کو اپنے ظاہر و باطن کا اظہار کرنے کی ایسی جرأت پروین شاکر نے دی ہے۔ بھلا ہو اس کا کہ اس کی وجہ سے لبنیٰ صفدر بھی ہم تک پہنچی مگر مجھ تک یہ لڑکی بارشوں کے موسم میں پہنچی ہے۔ ''ہجر ہے یا وصال''، ''محبت آئینہ کر لو'' یا ''تمہیں تو میرا ہونا تھا'' جیسے سوال آمیز مجموعے پہلے کے ہیں اور مجھ تک پہنچے بھی نہیں۔ ''مگر بارشوں کے موسم میں'' بھیگی ہوئی لبنیٰ صفدر کی غزلیں ان کے پچھلے مجموعوں کی غزلوں کی آئینہ دار ضرور لگتی ہیں۔ وہ اس شعری سفر کی چوتھی منزل پہ تنہا نہیں نظر آتی، بلکہ محبت کا تجربہ ''ہجر و وصال'' کے پل صراط سے گزرتے ہوئے عکس و آئینہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔

ذرا ان شعروں سے گزرے ہو سکتا ہے آپ بھی میری بات کی تصدیق کریں۔

جس کو چھپا رہی ہوا بھی اپنے آپ سے
تم دیکھنا وہ قصہ زمانہ سنائے گا

....

سنو سفر ہے محبت کا، یوں کٹے گا نہیں
سوا ایک وجہ کا ہم کو خیال رکھنا ہے

....

بس اس کی دوری سے میرا بکھر رہا ہے وجود
وہ میرے پاس اگر ہو، بحال ہو جاؤں

....

بس آنے والی ہے اک خوش بدن کی یاد ابھی
ذرا سی دیر میں خوشبو بکھرنے والی ہے

....

یہ چاروں شعر Self Explanatory ہیں۔ شاعر اگر محبت کسی اور سے نہیں کر رہا ہوتا تو خود سے ضرور کر رہا ہوتا ہے۔ وہ خود سے ہم کلام ہوتے ہوئے بھی در اصل کسی اور سے ہم کلام ہو رہا ہوتا ہے۔ مگر لبنیٰ کا مسئلہ خود کلامی یا ہم کلامی نہیں،

ذرا غور کیجئے:

جب ہوا در بجانے لگتی ہے
کیوں تیری یاد آنے لگتی ہے
تو کسی شام گر نہ یاد آئے
شور چڑیا مچانے لگتی ہے

دراصل شاعر اور شاعری کے درمیان کسی تیسرے کا وجود لازمی ہے۔ لبنیٰ کی شاعری بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ دیکھئے:

یاد کرنے کو اور بھی کچھ ہے
کیوں ہے تیرا ہی دھیان بارش میں
وہ نہ آیا تو آگئی بارش
اور دل کو دکھا گئی بارش
میرے آنسو جسے بجھا نہ سکے
آگ ایسی لگا گئی بارش

شعر برائے شعر بھی ہوتا ہے، مضمون آفریں شعر بھی ہوتا ہے، کچھ شعر برائے شعر بھی ہوتے ہیں اور کچھ شعر حسب حال بھی ہوتے ہیں۔ کچھ شعر حسی اور وجودی تجربوں کی آمیزش سے ایک ایسے Relation ship کو بھی منعکس کرتے ہیں جن پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

دریچے رکھتا ہے روشن، دیئے جلاتا ہے
وہ شام ہوتے ہی مجھ کو بہت ستاتا ہے
سنا ہے چاند کی کرنوں سے روز ہی وہ شخص
کسی کے خواب بدن کی ردا بناتا ہے

Sensitive رومانیت کا اظہار لبنیٰ صفدر کی ہر غزل اور نظم میں پائی جاتی ہے۔ ہجر و وصال کے درمیان اپنے وجود، اپنی محبت اور زندگی میں کسی اور کے ہونے اور نہ ہونے کا بھرپور اظہار جو لبنیٰ صفدر کے بارشوں کے موسم میں ملتا ہے، وہ یقیناً اس بات کا غماز ہے کہ محبت کی شاعرہ اور محبت کی تمنا بلکہ تمنا کے اس پیکر کو ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔

دہشت/ افسانچہ

عجیب معاملات ہیں اپنا شہر اپنا نہیں رہا وہ گلی کوچے جہاں ہم گھنٹوں کھیلا کرتے تھے۔ سنسان ہو گئے ہیں چاروں طرف موت و دہشت کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ہر لمحہ ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو ویسا نہ ہو، چوری چکاری تو عام سی بات ہے جان کا ہی دھڑکا سا لگا رہتا ہے یہ جینا بھی کوئی جینا ہے ڈر خوف اور دہشت کے سائے میں۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے۔ اس طوق کو گلے سے اتار پھینکیں مگر کریں تو کریں کیا۔ نظام حکومت چلانے والے بھی تو چور ہی بیٹھے ہیں۔

اس نے یہ سب سوچتے سوچتے پٹرول ڈلوایا موٹر سائیکل دوبارہ اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی اسکا پیچھا کر رہا ہے۔ نہیں یہ میرا وہم ہے اس نے اپنے آپ کو تسلی دی مگر خوف و دہشت کے سائے اس کے سر پر منڈلاتے چلے گئے۔ ہاں ابھی کچھ عرصہ قبل کی ہی بات ہے جب وہ گھر سے کسی دوست کی طرف جانے کے لیے نکلا تھا تو کنپٹی پر بندوق رکھتے ہوئے ایک شخص نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ بٹوے میں بل جمع کروانے کے پیسے بھی تھے۔ اور گھڑی بھی۔۔۔۔ جو سسرال سے ملی تھی۔ بیگم کو جس کے لٹنے کا دکھ میری جان کے بچنے کی خوشی سے زیادہ تھا۔ خیر شہر کا یہ معمول کئی عرصے سے تھا۔ اور آج پھر کوئی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے وہم کو یقین میں بدلنے کے لئے موٹر سائیکل کچھ تیز کی جواب میں پیچھا کرنے والے نے بھی موٹر سائیکل تیز کر دی۔ دہشت کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

جیب میں گڑیا کی فیس کے پیسے اور گھر کے سامان کے کچھ پیسے ہیں۔ وہ ان غنڈوں نے تھیا لیے تو سارا مہینہ ادھار پر گزرے گا۔ اور ادھار تو محبت کی قینچی ہے۔ پچھلی بار جب ایسا ہوا تھا تو چچا کی ہمدردی چچی کو خاص بری لگی تھی۔ نجانے رشتوں کو کیا ہو گیا ہے محبت کی مٹھاس کہیں کھو گئی ہے۔ محبت مٹھاس اس نے اپنے خیال سے سوال کیا۔ کہ اچانک اسے شور اور تیز بارن کی آواز آئی۔ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں میرا پیسہ میری جان، جان کا خیال آتے ہی گڑیا کا چہرہ اسکی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اور یتیمی میں یتیمی کا دکھ میں جانتا ہوں کیا ہوتا ہے نہیں یا خدا! رحم فرما اب تیرے سوا سہارا کیا ہے۔ میں کسی سڑک کے کنارے ان دہشت گردوں کی گولی کھا کر مرنا نہیں چاہتا اے میرے رب کوئی ترکیب نکال اس نے سوچتے ہوئے اپنی تمام تر ہمت کو جمع کیا اور موٹر سائیکل کو تیز بھگاتے ہوئے اشارہ بھی توڑ دیا۔

قانون شکنی تو کبھی اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھی مگر آج بات مزاج کی نہیں جان کی تھی اور ان پیسوں کی بھی جو بنک سے اس نے ابھی نکلوائے تھے۔ پیسے خود کے ہوں تو اور بات ہے چچا کے بھیجے ہوئے پیسے۔۔۔ پچھلی بار جب ایسے کسی نے لوٹ لیا تھا تو چچی کو لگا تھا کہ میں پیسے کھا گیا ہوں سو طرح کے وہم کیے تھے ان نے اور گھر میدان جنگ بنا رہا تھا۔ چور ہونا کس قدر غلیظ مزاجی ہے۔ ایسا طعنہ سننے سے تو بہتر ہے کہ انسان گولی کھا کر مر جائے کم از کم شہید تو کہلائے۔ اس نے یہ سوچ کر موٹر سائیکل کو فل سپیڈ دی اور ٹریفک سگنلز توڑتا ہوا گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ اس اثنا میں وہ پیچھا کرنے والے بھی موٹر سائیکل کو بھگانے لگے۔ یہ ریس ابھی چل ہی رہی تھی کہ اچانک اس کی موٹر سائیکل کے سامنے ایک کتا آگیا۔

اس نے لامحالہ بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے جیسے ہی موڑ کاٹا۔ وہ پیچھا کرنے والے تیزی سے آگے بڑھے اور اس کا راستہ کاٹ کر سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اس کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیت جاتی رہی اسے اپنا آپ کسی خلا میں محسوس ہونے لگا۔ چچا، چچی کی باتیں گڑیا کی مسکراہٹ اور ناراضگی ادھار پر مہینہ بھر گزر کرنے کا خوف اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگا۔ اس نے موٹر سائیکل کو گرایا اور دوڑنے ہی والا تھا۔ کہ ان دو لڑکوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اس نے مزاحمت کی کوشش میں جیسے ہی اپنا بازو کھینچا ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"پاجی تسی اپنی بٹوا ای پٹرول پمپ تے چھڈ آئے او"

(سدرہ افضل، لاہور)

تنہا رہنا سیکھ لیا ہے

صفیہ حیات

تنہائی ایسی کیفیت ہے، جس میں انسان ساری دنیا سے بے خبر ہو کر خود سے ملتا ہے۔ اپنے خالق سے باتیں کرتا ہے۔ کبھی شکر ادا کرتا ہے تو کبھی اپنی بے بسی پر رو کر اس کے قادرِ مطلق ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت میں وہ لفظ سے جملہ اور جملے سے کہانی کا تانا بانا بُننے کا ہُنر سیکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محبت انسان کو تنہائی کا تحفہ عطاء کرتی ہے۔ پھر محبوب سے کلام کرنا سکھاتی ہے۔ محبوب کے خیال سے باتیں کرتا کرتا عاشق، عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کے مرحلہ تک آ پہنچتا ہے۔ یہ جذبہ عشق ہی ہے جو مٹی کے پتلے میں ایسا بھانبڑ مچاتا ہے کہ وہ اصلِ ذات سے اصلِ کائنات کی جستجو جھولی میں ڈالے تخلیق کار کی مسند پر جا بیٹھتا ہے۔ اس کے اندر اظہار کا جوالہ مُکھی لہریں لیتا اس کی سوچ، خیال اور فکر، تنہائی کے کالے کوٹھے کو اشعار کی روشنی بن کر جھلمل ستاروں جیسی چمک سے آراستہ کرتی ہے۔

ہو گئے ہیں، اپنی تنہائی میں گم
ہم تمہاری محفلوں کا کیا کریں

جعفر حسن مبارک صاحب سے میری ملاقات مختلف ادبی محفلوں میں ہوئی۔ کبھی انھیں کسی کتاب کی رُونمائی میں صاحبِ صدر اور کبھی مہمانِ اعزاز کی نشست پر براجمان ایک مضمون نگار کی حیثیت سے میں اپنا مضمون پڑھتی تو یوں سراہتے کہ ان کے کہے جملوں کی بازگشت کئی دن تک سنائی دیتی اور میرا قلم رُکنے کا نام نہ لیتا۔ میں لکھتی چلی جاتی۔ منتشر دماغی کیفیت جو کبھی کبھی طبیعت پر غالب آجائے تو میں کئی شب و روز لکھنے سے بہت دور ہو جاتی ہوں، مگر ادبی محفلوں میں ادبی شخصیات کی حوصلہ افزا کلمات سن کر میں آفرین و ستائش کے جملوں کی طاقت سے آشنا ہوئی کہ ان کی بدولت ایک بھرپور توانائی مٹی کے پتلے میں سرایت کر جاتی ہے اور یہ ایسے ایسے کارنامے انجام دیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

واہ، بہت خوب، کیا خوب کلام ہے، یہ وہ ستائشی جملے ہیں، جو جعفر حسن مبارک اکثر نئے لکھنے والوں کی شان میں کہتے ہیں۔ پھر یہ عام لوگوں میں خود کو نہیں خیال کرتے۔ اُن کی واہ واہ لکھنے والوں کے سفر کو یوں آگے کی طرف بڑھاتی ہے کہ جب یہ پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم شاید اتنا سفر طے نہ کر پاتے۔ اگر کسی کے حوصلہ افزا الفاظ کی بازگشت ساتھ ساتھ نہ رہتی۔ یہ ادبی قبیلہ سے تعلق رکھنے والے بہت ہی حساس اور لاڈلے ہوتے ہیں۔ انہیں محبت اور پیار کے بولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی تلخ بات کا زہر ان کی دل شکنی کا باعث بن جاتی ہے۔ تنہائی اور ادب ساتھ ساتھ سفر طے کرتے ہیں۔ تنہائی کے لمحات میں ہی ادبی پھولوں کی کیاری مہکتی ہے۔ ان پھولوں کی مہک ان کو عام سے خاص بنا دیتی ہے۔ گرچہ یہ سفر سہل نہیں، بہت دشوار ہوتا ہے۔ مگر جب انسان پُرعزم اور ارادے پختہ ہوں، پھر کوئی رکاوٹ رستہ نہیں روکتی۔ آگے بڑھنے کا سفر تیز تر ہوتا ہے۔ جعفر حسن مبارک کا شمار ایسے ہی نایاب لوگوں میں ہوتا ہے، جو معاشرے کا مُحسن اور قابلِ فخر سرمایہ ہوتے ہیں۔ آپ P.H.D ڈاکٹر ہیں۔ نہ صرف ادبی سرگرمیوں میں ان کی موجودگی پروگرام کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے، بلکہ تعلیمی اور فلاح و بہبود کی خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ جیل خانہ جات میں (No Official Visitors) کے طور پر بیش بہا خدمات انجام دیتے ہیں بلکہ انجمن فلاح مریضاں الائیڈ ہسپتال فیصل آباد کے صدر اور ایفی سموکنگ روٹری انٹرنیشنل پاک و افغان زون کے چیئرمین ہیں۔ وزارت بہبود آبادی حکومت پاکستان اور وزارت سماجی بہبود آبادی حکومت پنجاب حاصل رہی۔ صدارتی ایوارڈ (پرائیڈ آف پرفارمنس) نامزد ہوئے۔ ساغر صدیقی فاؤنڈیشن ۱۹۹۵ء کا ایوارڈ حاصل کیا۔ قلم و قرطاس سے ان کا رشتہ کب جُڑا۔ شاید انہیں خود بھی یاد نہیں۔ ان کی مطبوعات ان کے رشتۂ کہن کا اعلان کرتی ہیں۔ طبیعت میں تنوع ہے۔ میں اسے اللہ کی خاص رحمت کہوں گی۔ جوان پر سایہ فگن ہے۔ یہ ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ شعر کہتے ہیں، تو جذبات و احساسات کے یوں ترجمان بن جاتے ہیں کہ قاری اشعار کو پڑھ کر محسوس کرتے ہیں کہ یہ جذبے تو ان کے اپنے ہیں۔

جعفر حسن مبارک صاحب کی یہ خوبی کمال ہے کہ جب داستانِ سفر لکھتے ہیں تو اپنے سفرناموں میں قاری کو ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ دیگر ادبی اصناف خاص کر شاعری سے ناطہ بہت مضبوط ہے۔ (نئے دنوں کے خواب)، (تنہا رہنا سیکھ لیا ہے) اسی تخلیقی لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ جعفر صاحب کی غزل موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں حوالوں سے منفرد ہے۔ ان کی شاعری واضح طور پر روحِ عصر کی نمائندہ ہے۔ حمدیہ، نعتیہ، سلام، نظم اور غزل ہر صنف میں بڑے ذوق و شوق سے طبع آزمائی کی اور ہر کاوش قابلِ تحسین ہے۔ جعفر حسن مبارک اب خود شناسی اور خدا شناسی کے اس مقام پر ہیں، جہاں زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ بھیڑ اور ہجوم سے کنارہ کش ہونے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ کسی محفل میں سر جھکا کر تشریف فرما ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ خدائی

رازوں سے آشنائی کے بعد چپ چاپ سے قلم و قرطاس کے رشتے سے جُڑے خالق و مالک کے عاجزی وانکساری سے ثناخواں ہیں۔ایک ادبی محفل میں یوں گویا ہوئے کہ "جیسے جیسے جاننے کا عمل نئے اُگتے سورج کے ساتھ سفر طے کرتا ہے۔ اندر باہر خاموشی بڑھتی جارہی ہے۔فرحت بخش اطمینان اندر اُترتا جارہا ہے۔"

ان کی عظمت و بزرگی کی میں ہی قائل نہیں، حلقۂ ادب میں جب بھی ادبی شخصیات جیسے کا فران رشید، غلام رسول آصف، احمد شہباز خاور، اے۔ ایچ عاطف، جمال شاہد، پروفیسر ریاض مجید اور انجم سلیمی جیسے مہان انسان دوست ہیں۔ جب بھی ذکرِ خیر ہوا، ان کی عظمت کو سراہنے کے الفاظ میری سماعت میں رس گھولنے کے مترادف تھے۔ ان کی شخصیت کے ہر پرت کو کھولنا گو کہ آسان نہیں۔ سورج کو چراغ دکھانے کے مصداق ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بچے معصوم ہوتے ہیں۔حسد، بغض، کینہ اور ریا سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ جھوٹ نہیں بولتے، ان کی آراء سچ پر مبنی ہوتی ہے۔ اتفاق سے میرے بچے ایک بار اپنے پاپا کے ساتھ جعفر صاحب کے آفس گئے تو ان کے اعلیٰ اخلاق کے دیوانے ہو گئے۔ ان کی خوب خاطر تواضع کی اور بیٹیوں کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے کچھ پیسے ان کے ہاتھ میں تھما دیے کہ بیٹیاں خالی ہاتھ جائیں اچھا نہیں لگتا۔ یہ تو ہماری روایت ہے کہ بیٹی کا احترام کیا جائے۔ ہماری روایات ہی ہماری پہچان ہیں۔ ہمیں ان کا پاسدار ہونا چاہیے۔ یہ ہمارے معاشرے کا حُسن ہے۔

کسی کے دینے سے اگرچہ زندگی بسر نہیں ہوتی بلکہ سفرِ زندگی خوبصورت اور فضا پُر اعتماد ہو جاتی ہے۔ ورنہ ضروریاتِ زندگی تو اللہ کے دینے سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ دینے کا، عطا کرنے کا انداز خالق و مالک نے اپنے بندہ کو بھی بخشا ہے۔ مگر ہر کوئی بخل سے پاک سخاوت و عطاء پر بدرجہ اتم جانہیں پاتا۔

بہر حال کوشش کا عمل جاری وساری رہنا چاہیے اور یہ خصوصیت جعفر حسن مبارک کی شخصیت میں دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے انسانیت کے سوز و ساز کا اشتراکی گیت سمجھ لیا ہے۔ انہوں نے اس راز کو پالیا ہے کہ کائنات کے سب دکھ، سکھ، مشترکہ ہیں۔ رشتے ناطے جو فردِ واحد سے جُڑے ہیں۔ بحیثیت انسان کے ہم سب کے لیے قابلِ احترام ہیں۔

اسی لیے تو کہتے ہیں:

پیار کی بندگی بُری نہیں ہے
یہ حسیں خودکشی بُری نہیں ہے

ان کی ادبی اعلیٰ ظرفی ملاحظہ ہو کہ اپنی تخلیقی حیات کو اپنے احباب کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کو قرار دیتے ہیں۔ اپنی ذاتی کمال خوبی کو نظر انداز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میری ہستی ذرۂ خاک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی عاجزی انہیں عروج بالا کا مقام عطاء کرتی ہے۔

میں ان کی شخصیت کی تمام خوبیوں کا احسن طریقے سے اعتراف کرتے ہوئے دعا گو ہوں، حاسدین کی زہریلی ہوا میں زرد دوپہر کی تھکان سے انہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین!!!

تفریق/افسانچہ

حسب معمول لٹیرے باری باری بستی کے تمام گھروں میں گھس کر لوٹنے والے تمام اثاثے لوٹتے چلے آرہے تھے۔

محلے کا آخری مکان۔۔۔۔ اندھیرے سے گتھم گتھا مسکین پیلی روشنی میں بے چین وہ مرد اپنی چودہ سالہ بیٹی شاہدہ کو گھر کے پیچھے گھنی جھاڑیوں میں چھپا آیا تھا۔

مرد کی بوڑھی لاغر ماں اپنے بارہ سالہ پوتے کو گود میں دبوچے بیٹھی قدموں کی دھمک، دبی دبی چیخیں، غراہٹیں۔۔۔۔ سسکیاں سن سن کر ہول رہی تھی۔

باجی کہاں گئی۔۔۔۔ بچہ مچلنے لگا۔

ششش۔۔۔۔ بوڑھی عورت نے بچے کا منہ دبا لیا۔

مجھے باجی کے پاس۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔

بوڑھی عورت کے کمزور ہاتھوں کی گرفت بچے کی کمر پہ سخت ہوئی۔

چپ کر۔۔۔ مرد نے ڈانٹا۔

بچہ سہم کر دادی کی گود میں دبک گیا۔

لٹیرے آئے۔۔۔۔ اور سب کچھ لوٹ کر چلتے بنے۔

چھوٹا سا بچہ۔۔ فہم وشعور کی کئی سیڑھیاں ایک ہی جست میں پار کر گیا۔

جھاڑیوں میں چھپائی گئی لڑکی واپس آگئی۔

مرد اور بوڑھی عورت لڑکی کے بچ جانے پر خوب مطمئن تشکر کی سانسیں بھر رہے تھے۔۔۔

ذرا دیر بعد۔

مرد چارپائی پر بازوؤں میں چہرہ چھپائے بیٹھے بچے کے نزدیک آیا۔

اوے پاگلاں۔۔۔۔ روتا کیوں اے۔

بچے نے بکھرے بالوں والا جھکا سر اٹھایا۔۔

اسکی سرخ آنکھوں میں وحشتیں رقصاں تھیں۔

بھیگی بھیگی آپس میں چپکی ہوئی پلکیں کچھ دیر قبل ہوئی دھواں دار برسات کی غماز تھی۔

خاموش لبوں پر سسکیوں کا ماتم اور خشک حلق میں اذیت ناک چیخوں کی بازگشت اب بھی جاری تھی۔

بچے نے اپنے باپ کو دیکھا۔۔۔۔ اور مرد بچے کی حالت بغور دیکھتے، اس کی نادانی پر ہولے سے مسکرایا۔

"مرد ہو کے روتا اے۔۔ تو تو بالکل ہی جھلا ہے۔

اے۔ عزت تو زنانیوں کی لٹ تی اے۔"

(رشکِ حبیبہ، کراچی)

وحید قندیل کی مونا لیزا

تسنیم کوثر/ لاہور

۷ رجون ۲۰۱۵ء کی تپتی دوپہر میں UMT کے ٹھنڈے ٹھار ہال میں زبردست لاہوری ناشتے کے دوران حسن عباسی نے ''مونا لیزا اک تصویر'' مجھے تھماتے ہوئے اپنے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں اس کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت کی دعوت دے ڈالی۔

حسن عباسی ہم سب کے پیارے شاعر ہیں انہیں انکار ممکن ہی نہیں، سو تقریب میں جانا لازم ٹھہرا اور...... جانے سے پہلے کتاب کو پڑھنا اور بھی ضروری کہ...... حسن نے کتاب پہ رائے دینے کو بھی کہا تھا، کتاب کا نام خوبصورت تھا مگر شاعر میرے لیے اجنبی......

کتاب کی خوبصورتی تو حسن عباسی کی مرہون منت ہوئی کہ یہ ممکن ہی نہیں، کتاب حسن عباسی کے ہاتھوں سے نکلے اور خوبصورت نہ ہو کہ حسن تو وہ پارس پبلشر ہیں، جس کتاب کو ہاتھ لگا دیں وہ سونے کی بن جاتی ہے، حسن میں اور بہت سی خوبیوں کے ساتھ یہ خوبی بھی ہے کہ وہ دوستوں کے دوست تو ہیں ہی مگر جنہیں زیادہ نہیں جانتے وہ ان کے بھی دوست ہیں، مونا لیزا اک تصویر میں انہوں نے لکھا کہ...... وحید قندیل سے ان کی صرف تین ملاقاتیں ہوئیں اور اُن تین ملاقاتوں میں حسن عباسی نے اپنی زبردست قوت مشاہدہ سے وحید کی زندگی کے ہر پہلو سے آشنائی حاصل کی۔ ان کے خواب کو حقیقت کا روپ دیا اور انہیں صاحب کتاب بنا دیا...... انہیں ہم سب سے ملوا دیا ہے۔

شاعری کی کتاب سرسری انداز میں نہیں پڑھی جاتی۔ یہ تو قطرہ قطرہ جذب کی جاتی ہے۔ میں نے بھی ''مونا لیزا اک تصویر'' کو قطرہ قطرہ جذب کیا...... وحید قندیل کو جانا...... اس کے حالات کو جانا...... وحید قندیل نے کتاب کے پیش لفظ میں جس جرأت کے ساتھ سچائی کو پیش کیا وہ قابل تحسین ہے۔ وحید نے جو کیا ان کے انکل بدیع الزماں نے بھی اسی پہ روشنی ڈالی اور وحید کی ذات کی بہت سی پرتیں ہمارے سامنے رکھ دیں کہ کس طرح ایک محنت کش کا اداکاری کا شوق رکھنے والا بیٹا شاعری کے میدان میں آن پہنچا اور نہ صرف آیا...... بلکہ اپنے آپ کو منوایا بھی کہ شاعری ہی اس کا اوڑھنا بچھونا جو ٹھہرا۔ شاعری فقط لفظوں کو آگے پیچھے کرنے یا...... اوزان کے بل بوتے پر لفظوں کو ترتیب دینے کا نام نہیں بلکہ یہ تو ایک عطیۂ خداوندی ہے ایک خداداد صلاحیت ہے اور رب عظیم نے وحید کو اس دولت سے مالا مال کیا ہے۔

وحید محبت کا شاعر ہے اور محبت...... انسانیت کی معراج ہے محبت کے بنا، اس کائنات کا نظام درہم برہم ہے۔ محبت میں نارسائی کے دکھ...... ادھورے سپنوں کا کرب جب رگ و پے میں سرایت کرتا ہے تو ہنستی آنکھیں، بھیگ جاتی اس...... غم روزگار، غم آلام اور غم محبت میں مل جائیں تو شاعری کا جھرنا پھوٹتا ہے۔ درد کا ماہتاب چمکے تو...... دل کے کورے کاغذ پہ غموں کی چاندنی بکھرنے لگتی ہے تو دُکھ اشعار میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ہوا وحید قندیل کے ساتھ۔ ان کے غم کی چاندنی بکھری تو دُکھ شعار میں ڈھلتے چلے گئے۔ وحید قندیل نے خوبصورت ردیف قافیے اور مترنم بحور سے اشعار تخلیق کیے اور اُن کے درد نے اشعار کو پُر تاثر کر دیا۔

نعت میں وحید کہتے ہیں:

مرکزِ ارض بھی ہے محورِ خورشید بھی ہے
مخزنِ نور لطافت ہے مدینہ تیرا
دیس اپنے بھی کبھی مجھ کو بلا لو آقا
مرا ارماں مری چاہت ہے مدینہ تیرا

انسانی زندگی رشتوں میں گندھی ہوئی ہے اور ان رشتوں کی ڈور رویوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وحید نے زمانے کے گرم سرد دور دیکھے ہیں۔ رویوں اور رشتوں کی چبھن محسوس کی ہے تبھی تو انہوں نے ان سب جذبوں کو اشعار کے قالب میں ڈھالا اور غزل کی پُراسرار اور کٹھن راہوں میں ان گنت قندیلیں روشن کیں۔

وحید نے کہیں بھی دل چھوٹا نہ کیا بلکہ کشادگی کا اظہار کیا اور کہا:

چھوڑو یہ بیکار کی باتیں بھلا دو تلخیاں
میٹھے بولوں سے ذرا میٹھی بنا دو تلخیاں

میٹھے بولوں سے تلخیاں میٹھی بنانے کا فن وحید کو خوب آتا ہے۔ وہ اپنے اسی اسلوب سے قاری کے دل میں اترتے ہیں۔ وہ محبت کو اپنا سا بناتے ہیں اور محبت کی وادی میں قدم رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

خوش بخت ہے وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے
جس کو جہاں میں عشق کا آزار مل گیا

عشق میں آزار ہی ملا کرتے ہیں اور محبت کرنے والے ان آزار میں جیتے ہیں اور محبت کا دم

بھرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

تیری چاہت میں جو دیوان لکھے ہیں میں نے
اُن سے دو چار میں اشعار سُنا لوں ٹھہرو

اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئے کہ

بدلیاں پھر آرہی ہیں یاد ساون کی مجھے
اپنے کندھوں پہ ذرا زلفیں پریشاں کیجیے

مونالیزا اک تصویر...... وحید قندیل کے سچے اور کھرے جذبوں سے مزین ہے۔ انہوں نے اور بھی بہت خوبصورت شعر کہے ہیں۔ جذبوں کو لفظوں میں پرو کے ہمارے سامنے لائے ہیں اور پھر حسن عباسی اور افتخار شوکت جیسے مخلص دوستوں نے ان کے ساتھ ایک خوبصورت شام کا اہتمام کیا ہے۔ الزمر کے چھوٹے سے ہال میں لاہور کے ادبی ستاروں کی کہکشاں سجائی ہے۔ نیلما ناہید، ڈاکٹر صغرا صدف، رخسانہ نور، عمرانہ مشتاق، اقبال راہی سلیم اختر ملک سفینہ چوہدری ناز اوکاڑوی اور بہت سے ادیب شاعر بلائے ہیں۔ وحید قندیل اسی تقریب کے دولہا ہیں اور اپنے ساتھ دلہن بھی لائے ہیں۔ مریم ان کی شریک حیات ہیں، مریم کو دیکھا تو مجھے لگا جیسے وحید قندیل نے 'اپنی کتاب مونالیزا اک تصویر' کا عنوان مریم سے منسوب کیا ہے انہیں سامنے رکھ کے تجویز کیا ہے۔ حالانکہ شوہروں کی اکثریت اپنی بیگمات کی یوں مدح سرائی کی قائل نہیں لیکن وحید قندیل چونکہ محبتوں کے شاعر ہیں اور مریم ان کی محبت ہیں۔

میری دعا ہے کہ یہ خوبصورت شاعر اپنی خوبصورت مونالیزا کے ساتھ زندگی کی رعنائیاں سمیٹے کامرانیاں پائے اور ہمیں اپنی شاعری سے نوازتا جائے اور یقیناً ایسا ہی ہوگا اب کے جب وہ پاکستان آئیں گے تو ہمیں ایک اور کتاب سے نوازیں گے کیونکہ یہ شاعری بھی ایسی لت ہے جو کبھی نہیں چھٹتی اور حالات خواہ کیسے ہی ہوں یہ اپنا رستہ بنالیتی ہے، اپنا آپ دکھادیتی ہے خود کو منوالیتی ہے۔

میں وحید قندیل کو اس خوبصورت کاوش پر مبارکباد دیتی ہوں اور انہیں شاعری کا سفر جاری رکھنے کی تلقین کرتی ہوں۔

ٹھک / افسانچہ

''صاب جی! میں گھر پر اکیلا رہوں گا؟'' ستر سالہ نور الٰہی نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔

''ہاں!!!'' کلیم نے جواب دیا۔

''کب تک؟''...... ''بس ایک ہفتہ!!!''

''پورا ہفتہ صاب جی!!؟''

''ہاں!!!'' وہ نیچے جھکا اور اپنا بیگ لے کر لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔ مسز کلیم پندرہ منٹ پہلے ہی اپنے میکے ملحقہ گاؤں جاچکی تھیں۔

پہلے وہ اپنے بیٹے کو پیار سے ''صاب جی'' کہتا تھا لیکن پھر کلیم کو عادت ہوگئی۔۔۔ تب سے نور الٰہی ''صاب جی'' کی رٹ لگانے لگا۔

نور الٰہی بید کی پرانی کرسی پر بیٹھ گیا، جو اس نے اپنی شادی کے بعد خریدی تھی۔ یہ کرسی صحن کے بیچ و بیچ پڑی تھی۔ گھر کیا تھا؟ چھوٹا سا صحن جس میں ایک طرف چارپائی اور دوسری طرف گھر کا فالتو سامان اور سیڑھیاں تھیں جو کھلی چھت تک لے جاتی تھیں۔ صحن کے پیچھے دو کمرے بھی تھے۔ ایک بیڈروم اور دوسرا ڈرائنگ روم، جو گھریلو کارخانے کی شکل اختیار کر گیا تھا، کلیم وہاں زنانہ جوتے تیار کرتا اور اپنے لاہور کے دکاندار گاہکوں کو بلٹی کروادیا کرتا تھا۔

کلیم کے جانے کے بعد نور الٰہی نے کرسی پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ جھولنا شروع کیا، جیسے وہ اس حرکت سے جادو کر کے وقت میں واپس لوٹنا چاہتا ہو۔ چیں چیں کرتی کرسی اس کوشش میں رکاوٹ پیدا کررہی تھی۔ نہ جانے کیوں اُس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا، سارا دن عجیب سی کشمکش اور بے لگام خیالات کی نذر ہوگیا۔ وہ شکستہ تختوں والا بحری جہاز معلوم پڑتا تھا، جو اپنی منزل سے دور تین چار دن تک لنگر انداز رہا۔ پانچویں روز اس نے ٹھان لی کہ آج وہ گزرے وقت میں اپنی کھوئی ہوئی یادوں کا سراغ لگا کر ہی دم لے گا۔ بندہ ناتواں تھا، مگر نیت نیک تھی۔ بالآخر وہ اپنے ماضی میں لوٹ ہی گیا۔

اُس کا بیٹا کلیم اپنی ماں کے ہاتھوں پر کھیل رہا ہے۔ نور الٰہی اور اُس کی بیگم رضیہ بانو کی آنکھوں میں بوڑھے کے کھوئے ہوئے خواب صاف نظر آرہے ہیں۔ وہ اپنے ہانپتے کانپتے بدن اور آخری عمر کے ارمان لیے اُدھ کھلی نگاہوں سے اُس بچے کی طرف دیکھتا ہے، جو اپنی ماں کی گود میں پڑا مسکراہٹیں بکھیر رہا ہے، جسے چلنے کے لیے کسی کے سہارے کی ضرورت ہے۔ وہ یادوں کی دولت سمیٹے بہت دور نکل آیا تھا۔

نور الٰہی اپنی نگاہیں ننھی جان سے ہٹا کر رضیہ بانو کو دیکھنے لگا، پھر اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے خوابوں سے مردہ لاش کی بدبو آرہی ہے۔ جو کبھی زندہ نہیں ہوں گے۔ بزرگ بڑے لالچی ہوتے ہیں، کنگھے جی نہیں سکتے، ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اُسی مردہ لاش کا حصہ بن کر مردہ ہوگیا۔ کرسی چیں چیں کرتی خاموش ہوگئی۔ سات دن مکمل ہونے میں ابھی دو دن باقی تھے۔

دو دن بعد کلیم لاہور سے سیدھا سسرال پہنچا تھوڑی دیر بعد دونوں اپنے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔

گھر کا دروازہ کھلا۔ ایک جوڑا اندر داخل ہوا، جنہوں نے تخلیہ میں اپنائیت محسوس کی اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ وہ ایک دوسرے کے لمس میں مصروف بیڈروم کی طرف بڑھتے گئے۔ ایک ٹھک کی آواز۔۔۔۔ اور بیڈروم کے دروازے کو کسی نے اندر سے بند کرلیا۔

(محمد ابصار، لاہور)

ادبی وثقافتی میلہ 2015ء

ڈاکٹر عائشہ عظیم

دسمبر کا مہینہ، سال کے ۱۲ مہینوں میں الگ ہی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مہینے کی آمد سے جہاں کچھ لوگ کرسمس کی تیاری میں لگ جاتے ہیں وہیں کچھ لوگ سال کے ختم ہونے پر رنجیدہ بھی ہو جاتے۔ ایسے میں الحمرا آرٹس کونسل نے لاہور میں سہ روزہ ادبی وثقافتی میلہ سجالیا۔ جس میں ایک طرف تو دنیا بھر سے آئے ہوئے مندوبین نے شرکت کی تو دوسری طرف ان مہمانوں کو ملنے اور ان کی باتیں سننے کے لئے لاہور اور اس کے اطراف سے حاضرین کی ایک بڑی تعداد میلے میں اُمڈ آئی۔ ادبی اور فنونِ لطیفہ کے حوالے سے 40 کے قریب مختلف سیشنز رکھے گئے، جن میں ملک بھر اور بیرونِ ملک سے آئے ہوئے ادب کے افق کے تابناک ستاروں نے اس فورم کے ذریعے قیمتی معلومات فراہم کرتے ہوئے حاضرین پر سوچ کے در وا کیے۔

میلے کا آغاز 11 دسمبر 2015ء کو الحمرا آرٹس کونسل کے ہال II میں باقاعدہ طور پر افتتاحی تقریب سے ہوا۔ جس میں وزیرِ اعلیٰ پنجاب کی جانب سے ان کے ایڈوائزر سلمان صوفی نے شرکت کی۔ سٹیج پر رونق افروز ہونے والے مہمانانِ گرامی میں ٹی وی، فکشن، مصوری اور موسیقی کی دنیا کے لیجنڈز شامل تھے۔ بانو قدسیہ، انتظار حسین، ڈاکٹر ارتضٰی کریم، میاں اعجاز الحسن اور قوی خاں نے آرٹس کونسل کے چیئرمین اور میلے کے روحِ رواں جناب عطاالحق قاسمی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ اس موقع پر وزیرِ اعلیٰ پنجاب کا پیغام پڑھ کر سناتے ہوئے ان کے ایڈوائزر نے یہ اعلان کیا کہ اگلے سال سے گاڑیوں کی نمبر پلیٹوں پر 10 مرحوم ادبا کی تصاویر بھی پرنٹ ہوں گی۔ جس پر قاسمی صاحب نے مزاحیہ انداز میں کہا کہ یہ بہت اچھی کاوش ہے لیکن اس کے لیے مرحوم ہونا ضروری ہے۔ عطاءالحق قاسمی اپنی ذات میں انجمن ہیں۔ اگرچہ افتتاحی تقریب ایک سنجیدہ تقریب تھی لیکن اس کے باوجود قاسمی صاحب نے اسے زعفران زار بنائے رکھا۔ ایسا صرف وہ ہی کر سکتے ہیں۔ تقریب کی نظامت میں اصغر ندیم سید کے حصے میں آئی۔

میلے میں دن کے وقت 3 مختلف ہالز میں ایک ہی وقت میں مختلف سیشنز ہو رہے ہوتے۔ اس فیسٹیول میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو یہ شکوہ کرتا نظر آیا کہ بیک وقت تین مختلف سیشنز رکھے جانے سے تشنگی رہ گئی، سمجھ نہیں آئی کہ کس میں شرکت کریں اور کس میں نہ کریں، لیکن غیر جانب داری سے دیکھیں تو یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ حاضرین اپنی اپنی دلچسپی کے مطابق مختلف سیشنز میں شامل ہوئے اور یوں کم وقت میں بہت سے موضوعات کو ایک فورم پر زیرِ بحث لایا گیا۔ مہمان نہ صرف اپنے مقالے پڑھتے، بلکہ حاضرینِ محفل کے سوالات کے جواب بھی دیتے۔ میں نے بھی چونکہ انتظامی امور میں اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی اور مہمانوں کو ہالز کی طرف راہنمائی کر رہی تھی۔ اس لیے میں اس بات کی چشم دید گواہ ہوں کہ تینوں ہالزیوں کھچا کھچ بھرے ہوتے کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ ہوتی۔ حال یہ ہو جاتا کہ ہالز کی سیڑھیوں میں بھی بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی۔

یہ میلہ نہ صرف ادبی نقطہ نظر سے اہم تھا، بلکہ ہمارے کلچر اور روایت کی نمائندگی بھی کر رہا تھا۔ ایک کونے میں کتابوں کے سٹالز تھے تو دوسرے کونے میں مختلف صوبوں کی ثقافت کی نمائندگی کرنے میں مختلف صوبوں کی ثقافت کی نمائندگی کرنے والے سٹالز موجود تھے۔ ایک طرف فوڈ سٹال سجا ہوا تھا جس میں روایتی کھانے اپنی خوشبو سے حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے تو دوسری طرف پوپ سنگرز، فوک سنگرز اور سٹریٹ سنگرز نے بھی میلہ لوٹ لیا۔

الحمرا انٹرنیشنل لٹریری اینڈ کلچرل فیسٹیول میں دن بھر تو ادبی محفلیں جمتیں اور شام میں موسیقی اور مشاعرے کی رنگارنگ محافل سج جاتیں۔ پہلے روز وہاب شاہ ڈانس کمپنی اور نگہت چودھری کا شاندار کلاسیکل رقص تھا تو دوسرے دن پاک و ہند مشاعرہ تھا جس میں نہ صرف بھارت اور پاکستان بلکہ دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے شعراء کرام نے اپنی شاعری سے محفل کو گرمائے رکھا۔ مشاعرے کی صدارت انور شعور نے کی۔ مزید برآں بھارت سے کیول دھیر، خوشبیر سنگھ، رنجیت سنگھ، اشوک چکر دھر، عبید صدیقی اور پاکستان سے انور مسعود، کیپٹن ریٹائرڈ عطا محمد خاں، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور فرحت احساس بھی سٹیج پر رونق افروز تھے۔ نظامت عطاءالحق قاسمی اور ڈاکٹر صغرا صدف کے حصے میں آئی۔ حاضرین اپنے پسندیدہ شعرا کو بار بار سننے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور مکرر مکرر پکارتے اور کھلے دل سے داد دیتے۔ اس میلے کا اختتام عارف لوہار کے چمٹے نے کیا۔ تیسرے روز محفلِ موسیقی تھی، جس میں عارف لوہار، ثریا ملتانیکر اور شفقت علی خاں نے سُر بکھیرے۔ تحسین رانا نے اس قدر خوب صورت انداز میں ہیر پڑھی کہ سماں باندھ دیا۔ اس محفل میں زندہ دلانِ لاہور اس طرح اُمڈ آئے کہ کھڑکی توڑ نہیں بلکہ دروازہ توڑ رش تھا۔ ہال اس قدر بھر چکا تھا کہ مندوبین کو بیٹھنے کو نشست میسر نہ آئی۔ جسے جو ملا اسے غنیمت جانتے ہوئے سیڑھیوں اور فرشی نشست پر اکتفا کیا، بلکہ اس محفل سے خوب لطف اٹھایا۔ میلے کے اختتام پر یہ صورت تھی کہ دل اداس ہو گیا کہ کاش یہ فیسٹیول ابھی ایک دو روز مزید جاری رہتا۔ بہر حال اس کامیاب فیسٹیول پر الحمرا آرٹس کونسل کے چیئرمین جناب عطاءالحق قاسمی، کیپٹن ریٹائرڈ عطا محمد خان اور زلفی صاحب خصوصی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ادب اور فنونِ لطیفہ کی ترویج اور فروغ کے لیے ایسے فیسٹیول اہم سنگِ میل ثابت ہو رہے ہیں۔

....

نوبل انعام یافتگان کا ترک وطن

عامر بن علی

''وہ شخص جو نیکر پہنے ہوئے اپنی گاڑی دھو رہا ہے، دو سال پہلے ''تویاما'' یونیورسٹی کے اس پروفیسر کو بیالوجی کے شعبے میں عالمی نوبل انعام سے نوازا گیا ہے۔'' میں نے اس دن سے پہلے کبھی کسی نوبل انعام یافتہ شخصیت کو روبرو نہیں دیکھا تھا۔ اسی لیے اپنے دوست کی بات سن کر ٹھٹک گیا۔ اس آدمی کو اپنی 660 سی سی سوزوکی کار کو ایک ہاتھ میں بہتے پانی کا ربڑ والا پائپ اور دوسرے ہاتھ میں شیمپو میں ڈوبا ہوا اسفنج پکڑے دھوتے ہوئے میں کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ محلے کے دوسرے عمومی گھروں کی طرح بیالوجی کے اس پروفیسر کا گھر بھی پانچ مرلہ رقبے پر مشتمل ہو گا، جس کے گیراج کے سامنے وہ اپنی سواری کو اگلے ہفتے کے لئے تیار کر رہا تھا، بالکل اسی طرح جیسے اتوار کے دن باقی اہالیان شہر گھر کے کاموں اور صفائی ستھرائی میں جت جاتے ہیں۔ پروفیسر بھی اپنے کام نمٹا رہا تھا۔ کھچڑی بالوں والے ادھیڑ عمر اس سائنسدان اور اس کی زندگی میں مجھے تو کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے اپنے محلے میں زیادہ مقبول بھی نہیں لگا، کیونکہ اہل محلہ آتے جاتے ہوئے اس سے سلام دعا بھی کوئی زیادہ نہیں لے رہے تھے۔

ندی کنارے واقع مذکورہ سائنسدان کے اس محلے سے میرا اتوار کے دن اکثر گزر ہوتا ہے۔ اس ندی کے شفاف پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں صاف دکھائی دیتی ہیں، دونوں کناروں پر درختوں کی قطاریں ہیں جن پر کبوتر، کوے، چڑیاں اپنی اپنی بولی بولتے ہیں۔ میری عادت ہے کہ چھٹی کے دن ان مچھلیوں اور پرندوں کو ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈالتا ہوں، خوراک کے حصول کے لئے جب یہ سب لپکتے ہیں تو بہت بھلے لگتے ہیں۔ کبوتر خاص طور پر جلدی فرینک ہو جاتے ہیں اور ہاتھوں سے ڈبل روٹی چھیننے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اب اس ندی کنارے محلے میں جب بھی جاتا ہوں تو مذکورہ پروفیسر سائنسدان کے گھر کی طرف اچٹتی ہوئی اک نگاہ غیر ارادی طور پر ڈال لیتا ہوں۔ میرا اب تک کا مشاہدہ یہی ہے کہ وہ عام شہریوں کی طرح ایک عام زندگی گزار رہا ہے۔ گو کہ اس نے بیالوجی کے شعبے میں غیر معمولی کام سرانجام دیا ہے مگر اس بات کا احساس تو اس کی یونیورسٹی اور لیبارٹری سے متعلق احباب کو ہی ہوگا، اپنی گلی، محلے میں تو وہ ایک معمول کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

پاکستان سے تعلق رکھنے والے تین افراد کو اب تک عالمی نوبل انعام دیا گیا ہے۔ پہلا نوبل انعام میرے آبائی ضلع کی تحصیل کبیر والہ کے ایک گاؤں رائے پور میں پیدا ہونے والے ہرگوبند کھرانہ اور دوسرا جھنگ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر عبدالسلام کو ملا تھا۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کو اپنے ان سابق طلباء پر فخر ہے۔ ڈاکٹر کھرانہ اور ڈاکٹر سلام نے بالترتیب بیالوجی اور فزکس کے شعبے میں اپنی خدمات کی بدولت یہ انعام پایا جبکہ تیسرا نوبل انعام سوات کی طالبہ ملالہ یوسفزئی کو امن کے شعبے میں دیا گیا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ مختلف دہائیوں میں انعام پانے والے ان تینوں افراد کو جب نوبل پرائز سے نوازا گیا تو یہ پاکستان چھوڑ کر بیرون ملک چلے گئے۔ دونوں سائنسدان تو یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں جبکہ ملالہ یوسفزئی نے گزشتہ دنوں برطانوی شہریت حاصل کر لی ہے۔ چند سال قبل طالبان کی طرف سے کئے گئے قاتلانہ حملے میں معجزانہ طور پر بچ جانے کے بعد وہ برطانیہ میں رہائش اختیار کئے ہوئے ہے۔ سوچتا ہوں کہ عالمی شہرت کے حامل یہ نوبل انعام یافتگان پاکستانی اگر ملک چھوڑ کر نہ جاتے تو پاکستان کو ان باصلاحیت افراد سے بہت فائدہ پہنچتا۔ میں کسی مذہبی اور سیاسی بحث کو ہوا دینا نہیں چاہتا، بس ایک سادہ سی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ جب چوتھے اور پانچویں پاکستانی کو نوبل انعام سے نوازا جائے تو اسے ترک وطن نہ کرنا پڑے۔ ہمارے معاشرے میں اتنی برداشت پیدا ہو جائے کہ رنگ، نسل، مذہب، مسلک اور لسانی اختلافات کے باوجود لوگ پرامن طریقے سے اکٹھے رہنا سیکھ لیں۔ پاک سرزمین کی مٹی سے جس شخص کا بھی خمیر اٹھا ہے میرے نزدیک ریاست پاکستان پر اس کا میرے برابر حق ہے اور یہ حق اس سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا، چاہے اس شخص کا خاندانی پس منظر اور نظریات کچھ بھی ہوں۔

جاپان کے دور افتادہ ساحلی شہر کے ندی کنارے واقع محلے میں جب بھی میں نوبل انعام یافتہ مذکورہ سائنسدان پروفیسر کو دیکھتا ہوں تو دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش پاکستان کے گلی کوچوں میں بھی ایسے عالی دماغ پرسکون اور نارمل زندگی گزار سکیں۔ عظمت کے خراج کے طور پر انہیں اپنی دھرتی نہ چھوڑنی پڑے۔

ایسے تو کوئی ترک سکونت نہیں کرتا
ہجرت وہی کرتا ہے جو بیعت نہیں کرتا

دوسری جنگ عظیم میں جس چیز نے امریکہ کو اپنے اتحادیوں اور حریفوں پر فیصلہ کن برتری دلائی وہ ایٹم بم تھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ جس آئن سٹائن نے ایٹم بم ایجاد کیا وہ خود جرمن یہودی تھا، جرمنی میں ہی پلا بڑھا اور تادم مرگ اپنا تمام تحقیقی کام جرمن زبان میں کرتا تھا۔ ہٹلر کی تنگ نظری نے دیگر یہودیوں کی طرح اسے بھی ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا خواب ہے کہ آئندہ جس پاکستانی کو نوبل پرائز ملے وہ ترک سکونت کی بجائے کسی تعلیمی ادارے میں نوجوان طلباء کو اپنا علم منتقل کرے۔ دانش و حکمت کو پھیلائے۔ اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہے اور پاکستان میں روشنیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہو جائے۔

طنز و مزاح

"بچاؤ، بچاؤ کا شور اور کانوں پر مفلر......؟!؟"

حافظ مظفر محسن

ایک بچہ شور مچاتا ہوا بھاگا جا رہا تھا میں بمشکل اپنی موٹر سائیکل کو سنبھال پایا اور گرتے گرتے بچا۔ ورنہ شاید میں بھی شور مچا رہا ہوتا......

"اوئی ...... بچاؤ ...... ہائے بچاؤ" خیر میں نے موٹر سائیکل کھڑی کر دی اور ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا...... پورے معاملے کا جائزہ لیا اور کافی غور و خوض کیا مگر کوئی خطرے والی چیز دکھائی نہ دی۔

جب میں دوبارہ موٹر سائیکل کو سٹارٹ کر کے اس پر جانے کے لیے بیٹھنے لگا تو وہ چودہ پندرہ سال کا لڑکا بے چارہ پھر سے چیخا "بچاؤ...... بچاؤ"؟ میں نے غور کیا تو ایک موٹا تازہ "ملٹی کلر" کتا دکھائی دیا جو خون خوار آنکھوں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا اور نہایت غصیلے انداز میں غرا بھی رہا تھا اور شاید کاٹ بھی لیتا......

اس سارے سلسلے میں میری زیادہ توجہ بڑھتی دیکھ کر وہ بچہ میری طرف بڑھنے لگا مگر گردن ابھی بھی پیچھے کو مڑی ہوئی تھی کہ کہیں کتا چھلانگ لگا کر اس تک نہ پہنچ جائے اور اس کی پنڈلی کو دبوچ لے۔ میں نے کتے کو گھورا (جس پر کتے نے بالکل بھی توجہ نہ دی اور مجھے اپنے اس عمل پر کافی شرمندگی محسوس ہوئی) اور پھر زمین سے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر اسے مارا تو اس نے نہایت ہلکی بلکہ آپ کہہ لیں کہ بالکل دھیمی آواز میں صرف اور صرف دو مرتبہ "واؤ ...... واؤ ......" کہا۔ اور آہستہ آہستہ ایک کچے مکان کی دیوار کے ساتھ اس انداز سے بیٹھ گیا کہ جیسے پچھلے چند منٹ قبل ہونے والے واقعہ سے اس کا بالکل بھی تو کوئی تعلق نہیں......؟ مگر چوری چوری وہ اسی لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ اصل میں وہ لڑکے کو گھورنا چاہتا تھا مگر شاید میری بے تکلفی کے بعد اس نے گھورنے کا ارادہ بدل لیا اور صرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیا اور وہ بھی بددلی کے ساتھ؟ (مجھے کتے پر ترس سا آنے لگا)۔

میں نے دوبارہ موٹر سائیکل سیدھی کی تو وہ لڑکا رونے لگا۔ بھائی جان آپ نہ جائیں۔ یہ کتا مجھے کاٹ کھائے گا۔ یہ صرف آپ کا لحاظ کر رہا ہے (دل ہی دل میں میں خوش ہوا کہ کتا صاحب میرا خاصا لحاظ کر رہے ہیں میں نے اپنی چھوٹے سائز کی مونچھوں کو دو دفعہ تاؤ دیا...... اب آپ خود غور کر لیں کیوں......؟) معاملے کی سنگینی پر غور کرتے ہوئے میں میدان میں کود پڑا۔ میں نے موٹر سائیکل وہیں کھڑی رہنے دی اور لڑکے سے کہا کہ تم میری موٹر سائیکل کے پاس ٹھہرو...... میں کتے کے پاس سے گزرتا ہوں دیکھتے ہیں وہ مجھے گھورتا ہے یا کہ نہیں؟ واقعی میں بظاہر بڑی دلیری کے ساتھ کتے کی طرف بڑھا (میں نے کمال ہوشیاری سے لڑکے کو اندازہ ہی نہیں ہونے دیا کہ کتے کی طرف بڑھتے ہوئے میری دونوں ٹانگیں پوری کی پوری کانپ رہی تھیں) اور پھر میں نے سینہ پھلا لیا اور گردن بھی اکڑا ڈالی اور کمال ہمت سے کتے کے پاس سے گزرا۔ وہ لڑکا اور دیکھنے والے بھی میرے ساتھ حیرت زدہ ہوئے کہ کتے نے مزید اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا (گویا آنکھ ملانے سے بھی گھبرا رہا تھا) شاید اس نے بھی مجھ سے ادھار لیا ہو جو وہ بر وقت دے نہ سکا ہو اور اس نے تحریری طور پر معاف بھی کروا لیا ہو...... میں سوچ رہا تھا مگر پھر دل میں خیال آیا کہ میں تو خود کافی عرصہ سے مقروض ہوں میں نے بھلا کیونکر کسی کو ادھار دیا ہو گا؟ اور وہ بھی ایک عدد "ملٹی کلر" کتے کو؟ خیر جس طرح میں گیا تھا۔ ایسے ہی میں واپس بھی مڑا اور کتے کے پاس سے گزرتا ہوا واپس اپنی موٹر سائیکل کے پاس پہنچ گیا۔ مجال ہے جو کتے نے "تاؤں" بھی کیا ہو؟ (کتے کا یہ شریفانہ رویہ مجھے اچھا لگا)۔

"جا بچے......"

میں نے اس لڑکے کو مخاطب ہو کر کہا "دیکھا اس کتے کا بلڈ پریشر اب کافی نیچے آ گیا ہے اس نے مجھے گھورا تک نہیں۔ گزر جا جلدی سے۔ اب یہ تمہیں بھی کچھ نہیں کہے گا......؟

لڑکے نے ہمت کی اور جو کتے کے پاس سے گزرنے لگا تو کتے نے ساری شرم و حیا ایک طرف رکھی اور لڑکے کے پیچھے...... بھونکتا، غراتا یوں لپکا کہ میرا بھی دل کانپ گیا۔ تھا تو وہ کتا مگر اسٹائل اس نے چیتے والا بنا لیا (جعل ساز کہیں کا......؟)

وہاں کچھ لوگ آ کر مزید ٹھہر گئے۔ وہ لڑکا بھاگ کر پھر میرے پاس آ گیا۔ ایک صاحب جو اپنے حلیے سے پروفیسر لگ رہے تھے۔ نہایت ادب سے مخاطب ہوئے "بیٹا...... تم پریشان نہ ہو...... یہ کتا خاصا ذہین ہے جو اس لڑکے کو ہرگز ہرگز بھی تو پریشان نہیں کرنا چاہ رہا...... وہ تو اس کے ہاتھ میں پکڑی گٹھڑی سے تنگ ہو رہا ہے وہ (کتا) سمجھ رہا ہے کہ یہ لڑکا چور ہے اور گٹھڑی میں وہ کپڑے چرا کر لے جا رہا تھا یا کوئی اور چیز اور کتا ایک نہایت ہی وفادار (آج کے دور میں بھی) جانور ہے۔ اصل میں وہ اپنا فرض نبھا رہا ہے (میرے حساب سے کتا بھی غریب کا دشمن بن چکا ہے) میں نے پروفیسر صاحب کی یہ منطق عجب غور سے سنی اور جلدی سے لڑکے کے ہاتھ سے گٹھڑی چھین کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور کتے کے پاس سے تیز تیز قدم بڑھاتا

ہوا گزر گیا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے واپس بھی آ گیا۔ میں نے دیکھا پروفیسر صاحب خاصے شرمندہ ہوئے (حالانکہ انہیں ہرگز ہرگز بھی تو شرمندہ نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ پرانی تھیوریاں بدل چکی ہیں پرانے رسم و رواج دفن ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے دیسی گھی کھانے پر پابندی لگا دی ہے اور فیس سو گنا بڑھا دی ہے) مگر انہوں نے ہار نہ مانی۔ اپنے خاصے چوڑے منہ اور پیچھے کی طرف پھیلے بڑے سے ماتھے کو پکڑا اور سوچنے لگے اور پھر یکدم بول اٹھے "تو بٹا بات...... میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ اصل میں کتا بھی سمجھ چکا ہے وہ لڑکا غریب ہے اور کوئی چور اچکا ہو سکتا اور آپ شکل سے پڑھے لکھے لگتے ہیں؟ یہی وجہ ہے اس کے اس بار بار بدلتے رویے کے پیچھے؟ پروفیسر صاحب لڑکا غریب ہے تو کیا ہوا؟ میں بھی تو غریب ہی ہوں۔ گھر میں موجود فریج میں نے قسطوں پر لے رکھا ہے۔ یہ موٹر سائیکل جہاں میں کام کرتا ہوں انہوں نے مجھے لے کر دی ہے اور ہر ماہ میری تنخواہ سے قسطوں میں رقم کٹ رہی ہے۔ رہی بات شکل سے پڑھے لکھے نظر آنے کی تو حضور پروفیسر صاحب یہ کتا بے چارہ کون سا پچھلے جنم میں انسان رہ چکا ہے اور پڑھے لکھے اور ان پڑھ کے درمیان تمیز کر سکتا ہے؟ یہ فلسفہ میری سمجھ سے باہر ہے؟ میری وضاحت پر پروفیسر صاحب کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس دوران میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف میرا باس غصے میں تھا "میاں دو گھنٹے ہو گئے بینک سے پرانے نوٹوں کے بدلے تمہیں نئے نوٹ لانے کو کہا تھا گھر سے بیگم کے بار بار فون پہ فون آ رہے ہیں اور وہ مجھے پریشان (میں سمجھ گیا کہ باس "ذلیل" کی جگہ "پریشان" کا لفظ استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں) کر رہی ہے۔ جلدی واپس آؤ...... ورنہ میں......؟"

کاش باس کو پتہ چل جاتا کہ میں اور پروفیسر سڑک کنارے کھڑے کس قدر اہم خدمت سرانجام دے رہے تھے (ظالم سماج کو کسی کا نیکی کرنا بھی تو اچھا نہیں لگتا) پریشانی میں میں نے جلدی سے موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے کے لیے کک لگائی تو میری پاؤں کی ایڑھی پر اس زور سے لگی کہ میری چیخ نکل گئی...... پروفیسر صاحب بھی چیخ پڑے خیر میں نے موٹر سائیکل کو ریس دی اور دفتر کی طرف روانہ ہو گیا......!

"بھائی جان...... مجھے کتے سے بچاؤ......؟"

یہ فقرہ میرے کان میں گونجا۔ مگر میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس دوران کتے کے بھونکنے کی آواز بھی برابر سنائی دے رہی تھی۔ جس پر میں نے اپنا مفلر اپنے کانوں پر لپیٹ لیا۔

مجھے "ضرب عضب" کے حوالے سے پیپلز پارٹی اور زرداری صاحب کا رویہ یاد آ گیا۔ کراچی کا "ڈان" عزیر جان بلوچ جو بنیادی طور پر ان سیاستدانوں کا "پٹھو" اور کراچی کے سادہ دل شہریوں کا دشمن خاص تھا اور جس نے جرائم پیشہ افراد کا حوصلہ بڑھایا اور کراچی کے عوام کو نفسیاتی مریض بنا دیا۔ وہ اب رینجرز کی گرفت میں ہے اور بہت جلد بہت سی باتیں اگلے گا۔ جبکہ PPP چاہتی تھی کہ رینجرز اور انتظامیہ عزیر بلوچ اور دوسرے جرائم پیشہ افراد پر ہاتھ نہ ڈالے۔ کتے بھونکتے اور کاٹتے رہیں اور انتظامیہ کانوں پر مفلر لپیٹے لوگوں کو روتا چیختا چھوڑ کے چپکے سے نکل لے...... مگر خوش قسمتی سے رینجرز اور حکومت نے عہد کر لیا ہے کہ وہ کراچی کی عوام کو "ریلیف" دے کے رہیں گے......

میں نے جو دیکھا کہ گلدان میں انگارے ہیں
ہاتھ کے پھول بھی دیوار پہ دے مارے ہیں

دور حاضر کی تسلیم شدہ تفہیم القرآن شائع کرنے کے بعد

امام ابن کثیر الدمشقی کی تفسیر القرآن العظیم

تفسیر ابن کثیر (اردو)

جدید اور عام فہم اُردو ترجمہ کے ساتھ
پانچ جلدوں پر مشتمل
معیاری طباعت، دیدہ زیب سرورق سے آراستہ
پیش لفظ شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک صاحب کے قلم سے
دنیا بھر کے مفسرین کی نظر میں یہ تفسیر ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہدیہ: -/3500 روپے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے قلم سے

شروح کلام اقبال

جو برصغیر کے نقادان فن سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔
یہ شروح طلبا اور غواصان بحر معانی، دونوں کے لیے ایک نعمت مترقبہ بن گئی ہیں۔
جدید ایڈیشن مع کلام شائع ہو گئے ہیں۔

بانگ درا	750 روپے	پس چہ باید کرد	-/750
بال جبریل	750 روپے	پیام مشرق	-/700
ضرب کلیم	600 روپے	جاوید نامہ	-/1200
ارمغان حجاز اُردو	250 روپے	دیوان غالب	-/975

مکتبہ تعمیر انسانیت

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 042-37310530, 37237500

شاعری

دیے جلائے گئے، آئینے بنائے گئے
ہمارے بعد یہاں کون لوگ آئے، گئے
متاعِ درہم و دینار پر نہیں موقوف
میں سوگیا تو مرے خواب تک چرائے گئے
بہت سے لوگ ستائے گئے ہیں دُنیا میں
مگر وہ مجھ سے زیادہ نہیں ستائے گئے
سَحر کے وقت ہوا فیصلہ نکلنے کا
قدم بڑھانے سے پہلے دیے بڑھائے گئے
کسی کے عام سے چہرے کو بھولنے کے لیے
ہزار رنگ کے سپنے مجھے دکھائے گئے
پھر ایک بار اُسی ڈھنگ سے بہار آئی
سروں کی فصل کٹی، پھول بھی اُگائے گئے
زمین پاؤں پکڑتی ہے اُس علاقے کی
کہیں جو کھوئے گئے، اُس گلی میں پائے گئے
پناہ مل نہ سکے گی کسی کو گھر میں بھی
طیور صبح سے پہلے اگر اڑائے گئے
مجھے تھی جن کی غلامی کی آرزو ساجدؔ
اسیر کر کے مرے سامنے وہ لائے گئے

غلام حسین ساجد/لاہور

رنگ گہرا ہے پیار بچے کا
یہ نوشتہ ہے زرد پتے کا
ہیں تجلی صدارتیں تیری
لطف آتا ہے شعر پڑھنے کا
آدھے کاغذ کیے ہیں رد اُس نے
بوجھ ہلکا پڑا ہے بستے کا
سارے رستوں سے رہ گزرتا ہے
کیا ٹھکانا ہے شخص اندھے کا
میں نے لفظوں کے تار باندھے ہیں
کچھ قرینہ بھی ہو گا لکھنے کا
چٹکیوں میں مجھے اڑاتے ہو
میں غبارہ نہیں ہوں بچے کا
سارے گلشن میں کھل اٹھا ہے وہ
گُل تماشا ہے تیرے سہرے کا
جو بھی لکھنا ہے لکھ چکو ثاقبؔ
ہاتھ پکڑا ہے کس نے لکھتے کا

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

اُس آنکھ کا جادو الگ
سہمے ہوئے گھبرو الگ
تُو بھی بہانہ ساز ہے
دل ہے بہانہ جُو الگ
ہر ساز کی تانیں جُدا
ہر پھول کی خوشبو الگ
یکساں نہیں رنگِ انا
میں میں الگ تو تُو الگ
بلبل بھی خوش آواز ہے
کوئل کی ہے کُو کُو الگ
لہجے پہ اُس کے دم بخود
آنکھیں الگ ابرو الگ
وہ غم مٹانے کے لیے
بیٹھے کنارِ جُو الگ
آنکھوں سے آنسو تھے رواں
بکھرے ہوئے گیسو الگ
اُس پر بھی بس چلتا نہیں
یہ دل ہے بے قابو الگ
وحشی کی فطرت اور ہے
انسان کی ہے خُو بُو الگ
منصورؔ جو کھاتا ہے غم
پیتا ہے وہ دارو الگ

مظفر حسن منصور/خوشاب

کہیں جینے کی خواہش میں کہاں ہوتا نہیں ہوں
جہاں ہونا ہے مجھ کو میں وہاں ہوتا نہیں ہوں
بظاہر میں تمہارے درمیاں ہوتا ہوں لیکن
جو سچ پوچھو تمہارے درمیاں ہوتا نہیں ہوں
بسر کرتا ہوں کچھ لمحے پسِ موجود بھی میں
سو گاہے گاہے زیرِ آسماں ہوتا نہیں ہوں
میں اپنے پیچھے چھوڑ آتا ہوں حرف و نخل و اولاد
میں مر کر بھی مکمل بے نشاں ہوتا نہیں ہوں
سرِ دروازہ میرے نام کی تختی لگی ہے!
وگرنہ میں تو سالوں سے یہاں ہوتا نہیں ہوں
کبھی لکھتی ہے ریگِ خشک بھی میرا قصہ
میں دریا ہوں ہمیشہ تو رواں ہوتا نہیں ہوں
جوازؔ اس شہرِ افسردہ میں جینا بھی ہنر ہے
یہاں میں احتراماً شاداں ہوتا نہیں ہوں

ڈاکٹر جواز جعفری/لاہور

تباہی سے ہوئی ہے اس قدر دو چار یہ دنیا
کبھی شاید نہ بن پائے گی اگلی بار یہ دنیا
مُصوّر نے تو سطحِ آب سے مٹی اٹھائی تھی
مٹاتی جا رہی ہے اُس کے سب شہکار یہ دُنیا

اسے کیا وقت کے اندھے کنوئیں سے ہم نکالیں گے
نہ جانے کون سے عالم میں ہو اُس پار یہ دُنیا
زمانے ہو گئے ہیں نفرتیں تقسیم کرتی ہے
کبھی تو میرے حصے کا بھی دے گی پیار یہ دُنیا
انہی گلیوں میں کوئی کیمیا گر پھر سے آئے گا
صدائے نُور سے ہو جائے گی انوار یہ دُنیا
انہی خوش فہمیوں میں کٹ رہی ہے زندگی ساری
کوئی دھوکہ نہیں دے گی مجھے اس بار یہ دُنیا

نوید مرزا/لاہور

ہوئے جُدا بھی تو اپنا سُراغ چھوڑ آئے
سرِ نگاہ کئی ہم چراغ چھوڑ آئے
وفا کی راہ میں میرے قبیلے کے افراد
کہیں پہ جسم کہیں پر دماغ چھوڑ آئے
بہت عزیز تھی ہونٹوں کو پیاس کی نسبت
اسی لیے تو چھلکتے ایاغ چھوڑ آئے
بس ایک سجدہ کیا ہم نے گرم ریت پہ اور
مہکتے، میٹھے کھجوروں کے باغ چھوڑ آئے
لبوں پہ گھٹنے لگے رنج تو غضنفر ہم
وہ اُس کا شہر، وہ کنجِ فراغ چھوڑ آئے

غضنفر عباس سید/ساہیوال

روایت توڑنی ہے توڑتا ہوں!!
میں اُس دشمن سے رشتہ جوڑتا ہوں
بکھرتا جا رہا ہے ذرہ ذرہ
میں جس کو ریزہ ریزہ جوڑتا ہوں
یہ میری زندگی کا فیصلہ ہے
مری جاں! یہ بھی تجھ پہ چھوڑتا ہوں
مرے بس میں نہیں ترکِ تعلق
میں کس دریا کو واپس موڑتا ہوں
دھڑکتا ہے امین انجم وہ اس میں بھی
میں جس پتھر سے بھی سر پھوڑتا ہوں

محمد امین انجم/لاہور

کسی مقصد سے بھجوایا گیا تھا
میں بہکا تھا، نہ بہکایا گیا تھا
مری مرضی کہاں پوچھی گئی تھی
مجھے بس حکم فرمایا گیا تھا
مری حیرانیاں تھیں دیکھنے کی
مجھے جب خود سے ملوایا گیا تھا
دلوں میں روشنی بھر دی گئی تھی
قلم سے علم سکھلایا گیا تھا
ترے نقشِ قدم پر سر جھکانے
مری دیوار کا سایا گیا تھا
پڑا تھا سامنے فدیہ میں وہ ہار
دمِ رُخصت جو پہنایا گیا تھا
مری ہی عقل پر پتھر پڑے تھے
مجھے ہر گام سمجھایا گیا تھا
اگر وہ خود ہی سب کچھ تھا تو آکاش
مجھے کیوں سامنے لایا گیا تھا

احمد سُبحانی آکاش/لاہور

دیوارِ شب میں کوئی دریچہ یا دَر تو ہو
تاریکیوں کی کوکھ سے پیدا سحر تو ہو
طوفاں تو راستوں کے نشاں تک مٹا گیا
اس بے نشاں سفر میں کوئی رہگذر تو ہو
لے، آفتابِ قہر کے شعلے جو اپنے سر
صحرا میں کوئی ایک تو مثلِ شجر تو ہو
حرفِ دعا کا عرش کو چھونا نہیں محال
صدق و صفا کا ہاتھ میں زادِ سفر تو ہو
سب بے گھروں کے سر کو جو سایہ کرے عطا
نیلے فلک کی طرح کوئی ایسا گھر تو ہو
گلیوں میں رات کو جہاں پہرا ہو امن کا
سطحِ زمین پر کوئی ایسا نگر تو ہو
اب تو سحاب دل میں بھی صحرا کی دھوپ ہے
کوئی حسیں خیال کا دل میں شجر تو ہو

اسلم سحاب ہاشمی/ساہیوال

خوابوں سا کوئی خواب بنانے میں لگی ہوں
اک دشت میں ہوں، پیاس بجھانے میں لگی ہوں
بتلاؤ کوئی اسم مجھے ردِ بلا کا
میں آخری کردار بچانے میں لگی ہوں
سب خلقِ خدا ہو گئی چوپال سے رخصت
پھر کس کو کہانی میں سنانے میں لگی ہوں
بجھنے کو ہے اب خالی دیا عمرِ رواں کا
میں ہوں کہ ہواؤں کو منانے میں لگی ہوں
جس وقت سے آنے کا سنا ہے ترا، گھر میں
چیزوں کو میں رکھنے میں، اٹھانے میں لگی ہوں
رکنے نہ کبھی پائے سفر روشنیوں کا
دریا میں چراغوں کو بہانے میں لگی ہوں
برہم ہیں مزاج اپنے تو کیا اس کا سبب ہے
دنیا سے میں یہ بات چھپانے میں لگی ہوں
وہ صحن میں افلاک لیے کب سے کھڑا ہے
میں چھت پہ ہوں بادل کو اڑانے میں لگی ہوں
آرائشِ کاکل کا سبب تُو تو نہیں ہے
تتلی ہوں، میں پَر اپنے سجانے میں لگی ہوں
اک عمر ہوئی پیڑ پہ دو نام لکھے تھے
اک عمر سے یہ نام مٹانے میں لگی ہوں
جلتا بھی ہے، بجھتا بھی ہے، اڑتا بھی ہے جگنو
سورج کو یہ احساس دلانے میں لگی ہوں

ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ/لاہور

جب نہ کوئی کر سکا تھا گردشوں کا سامنا
میں ہی تھا جس نے کیا تھا وحشتوں کا سامنا
ہنس رہے ہو تم جو میری جرأتوں پر دوستو
آؤ تم بھی کر کے دیکھو آئینوں کا سامنا
میں نے اُس دم قافلے کی سربراہی تھام لی
جب ہُوا تک کر نہ پائی پربتوں کا سامنا

ریاض ندیم نیازی/سبّی

کاتبِ وقت کی تحریر بولتا کیسے
وہ مری یاد کہ جنگل سے نکلتا کیسے
اُس کو مطلوب تھا آزاد فضاؤں کا وقار
وہ پرندہ تھا کھلونوں سے بہلتا کیسے
مُنفرد ہونے کا دیتا بھی تو کیا دیتا ثبوت
ایک جگنو بھلا سُورج کو نگلتا کیسے
ایک وہ ظرف سمندر جسے کرتے ہوں سلام
زیست کے ظرفوں تماشوں سے اُچھلتا کیسے
کوچۂ شوق نہیں تھا کہ بولتا منظر
عشق تھا آتشِ ہجراں سے پگھلتا کیسے
وہ تو وہ ہے جسے پتھر بھی سمجھتے ہیں پہاڑ
اُس سے ٹکرا کہ کوئی رنج سنبھلتا کیسے
جو نہیں تھا وہ اُسے کیسے دکھا دیتا سلیم
آئینہ اپنی حقیقت کو بدلتا کیسے

عمران سلیم/لاہور

سارا الزام ہی مت شہر کے سر رہنے دے
واپس آنا ہے تو پھر گاؤں میں گھر رہنے دے
آنکھ کا سارا سمندر مرا دُشمن ٹھہرا
مجھے ساحل، نہ طلاطم، نہ بھنور رہنے دے
وہ مجھے آخری صف میں بھی بٹھا سکتا ہے
کب وہ چاہے گا کہ اُونچا میرا سر رہنے دے
ہر مسافر سے تھکاوٹ نہیں ہوتی برداشت
چند اشجار سرِ راہ گزر رہنے دے
مری تخلیق کو پہچان عطا کر مولا
یا مجھے تشنۂ تکمیلِ ہنر رہنے دے
یہ نہ ہو پھر کبھی دربار میں جانا پڑ جائے
ابھی دستار میں سُرخاب کا پَر رہنے دے
ترے بچوں کو بھی دریا نہ بہا کر لے جائے
ان کے ذہنوں میں تو سیلاب کا ڈر رہنے دے
اتنے آنسو نہ بہا ہجر میں اُس کے عابد
ڈوب جائے گا سمندر کا سفر رہنے دے

کہیں سوچوں کے صحرا ہیں، کہیں یادوں کے ٹیلے ہیں
ہماری آبلہ پائی کے یہ سارے وسیلے ہیں
شجر سے کٹ گرے لیکن اذیت مٹ نہیں پائی
کہ مٹی نے بھی پتوں کے پُرانے زخم جھیلے ہیں
نہ جانے کون سا آسیب ان لوگوں پہ طاری ہے
لہو پیتے ہیں اک دوجے کا، سب کے رنگ پیلے ہیں
لکھیں جتنی بھی اُلفت کی سبھی بے سُود ہیں باتیں
یہاں ماحول کے کاغذ مرے محبوب گیلے ہیں
ترے دن شام ڈھل جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے
کہ آنکھوں سے جو ٹکرائے سبھی منظر نکیلے ہیں
ہماری بات میں کوئی ریاکاری نہیں عابد
ہمارے لفظ لوگوں کے لیے کڑوے کسیلے ہیں

رائے عابد علی/شیخوپورہ

دل کا دریچہ ہے کہ مقفل نہیں ہوا
شاید کسی سے رابطہ معطل نہیں ہوا
کردار کوئی کم ہے کہانی میں اس لیے
مدت ہوئی فسانہ مکمل نہی ہوا
تصویر تو ہٹا دی ہے دیوار سے تری
تو میری آنکھ سے ابھی اوجھل نہیں ہوا
افسوس ہے یہی مجھے افسوس ہے یہی
تیری قبائے ناز سے صندل نہیں ہوا
اُس کے فراق میں ہوں نہ اُس کے وصال میں
کوئی کرم بھی مجھ پہ مسلسل نہیں ہوا
اب یہ حکومتیں ہی پرندوں کو سونپ دو
ایسا ہے کوئی شہر جو مقتل نہیں ہوا
اک اور زندگی مرے رب دان کر مجھے
عمرِ تمام کچھ مجھے حاصل نہیں ہوا

ساحل سلہری/سیالکوٹ

بعدِ اذان راہ میں مے خانہ پڑ گیا
ساقی کے سامنے بھی مجھے جانا پڑ گیا
چاہت کا وہ چراغ یہاں فطرتاً نہیں
دیکھا تجھے تو دل کو بھی سمجھانا پڑ گیا
لے لیجیے حیات مجھے چاہیے نہیں
قاضی کو سب کے سامنے بہلانا پڑ گیا
اپنے جگر ے خون بھی ٹپکا تو دیکھیے
ظالم کو اک لیت سے سہلانا پڑ گیا
عمرِ دراز اپنی دھواں ہو رہی تھی یوں
کچھ دوستوں کے دام میں بھی آنا پڑ گیا
محفل میں سب کے سامنے ہوتا نہیں ہوں میں
محفل میں اپنے آپ کو ہی لانا پڑ گیا
رقص و سرور دل پہ بھی طاری رہا کرے
اُن کا بھی تیر دل پہ مجھے کھانا پڑ گیا
وہ پوچھ کر سوال مجھے دیکھتا رہا
کچھ آنسوؤں کو آنکھ میں ٹھہرانا پڑ گیا
دے کر وہ جام زہر مجھے چھوڑنے لگا
بانہوں کا ہار بھی اُسے پہنانا پڑ گیا

محمد ابصار/لاہور

اس کی آنکھوں کا سمندر یاد ہے
ہم بھی ڈوبے جس کے اندر یاد ہے
ساتھ مل کر تم نے لوگوں کے ہمیں
مارے طعنوں کے جو نشتر یاد ہے
دستِ الفت تھام کر پھر اور کا
میرے دل میں گھونپا خنجر یاد ہے
سوچنا تجھ کو لبِ جُو بیٹھ کر
پھینکنا پانی میں پتھر یاد ہے
دیر تک رہنا مرا مدہوش پھر
پینا تیری نَے کا ساغر یاد ہے
جینا مرنا سنگ تم نے تھا کہا
سوچنا او بے وفا گر یاد ہے
وہ ہوا جب غیر کا تو اے سعید
دل پہ گزرا روزِ محشر یاد ہے

سعید محمد سعید/ لاہور

معطر ہو غزل مہکے رباعی
کروں محبوب کی مدحت سرائی
سرِ لب ہیں تبسم کے شگوفے
چٹخنی چاندنی بھی مسکرائی
ستارے گفتگو کرنے لگے ہیں
حسیں لگنے لگی ساری خدائی
تمناؤں کی دنیا جگمگائی
محبت سے ہوئی ہے آشنائی
گرائے رخ پہ وہ زرتار گھونگھٹ
لگائے نین میں سرمہ سلائی
چلی ہے بن سنور کے پی ملن کو
سجائے ہاتھ پر رنگِ حنائی
گھنی زلفیں پسارے منتظر ہے
ملن کی گھات میں شامِ جدائی

جسے پی کر غموں کو بھول جائیں
طبیبو! دو ہمیں ایسی دوائی
حبیبہ ہے تغزل کا تقاضہ
کرو کچھ میر سی خامہ نوائی

رشک حبیبہ/ کراچی

وہ تلوار کھینچتا ہوں میں
یار بے کار کھینچتا ہوں میں
یہ میرے کام کی نہیں دُنیا
پھر بھی آزار کھینچتا ہوں میں
میری مِٹی بکھرتی جاتی ہے
چاک دشوار کھینچتا ہوں میں
اور کچھ بھی نہیں بناؤں گا
تیرے آثار کھینچتا ہوں میں
اب تو اُس کا وصال ممکن ہو
ہجر سو بار کھینچتا ہوں میں

ساجد رضا/ جھنگ

آدمی کر دے یا پھر خدا کر مُجھے
اے مرے جسم اب تُو رہا کر دے مُجھے
خاک داں میں پڑی خاک ہوں اصل میں
رنگ بھر دے تُو مجھ میں اُٹھا کر مُجھے
میری حالت پہ ہنسنا نہیں دوستی
ہاتھ پھیلا کے اپنے، دُعا کر مُجھے
میری آنکھوں کو کیوں نوچتا ہے، بتا
دوست ہے، دے کوئی خواب لا کر مُجھے
کوزہ گر تجھ کو مُجھ سے غرض ہی نہیں
توڑ دے، توڑ دے پھر بتا مجھے

حیدر علی ساحر/ اوکاڑا

اصغر مغل

تو بڑا باکمال ہے اصغر
فن ترا لازوال ہے اصغر
تیرے فن میں ''برش'' کا کام نہیں
جس کا ''اس'' کو ملال ہے اصغر
کینوس پر جو رنگ بکھرے ہیں
اُن میں تیرا جمال ہے اصغر
کون ٹھہرے ترے مقابل میں
کس کو اتنی مجال ہے اصغر
ڈھونڈتا ہوں تری مثال کوئی
تو مگر بے مثال ہے اصغر
جھومتے ہیں ترے ہنر پہ سبھی
تو وہ فن کی دھمال ہے اصغر
رفعتیں تیرے اوج پر ششدر
تو وہ اوج و کمال ہے اصغر
تیرے فن کو سمجھنا مشکل ہے
تو وہ مشکل سوال ہے اصغر
فخر ہے وہ جہانِ فن کا جلیل
اِک اچھوتا خیال ہے اصغر

احمد جلیل/ اوکاڑہ

دے گئی درد دِل ادا اس کی
روح مہک گئی صدا اس کی
اس کی حالِ عمر روگ دوری کا
مِل سکے گی کہاں دوا اس کی
کوئی اوڑھ کر مہر و ماہ رِدا اس کی
ماں ہے اولاد کی سدا ہمدرد
کام آئے گی ہر دُعا اس کی
وصل کی آس سی لگی ہے مگر
مہر ہو گئی کہاں روا اس کی

جاوید عباس جاوید/ بھکر

ایک خواہش ہے آخری میری
وقت سے بات ہو کبھی میری
کھو گئی خار زارِ دُنیا میں
پُھول جیسی تھی سادگی میری
آئنوں سے مکاں بناتا ہوں
پتھروں سے ہے دوستی میری
زور سے قہقہے لگاتی ہے
طعنہ زن ہے شکستگی میری
اِک سمندر کے پاس رہ کر بھی
کم ہوئی کیوں نہ تشنگی میری
میں نے دل کا گلا دبا تو دیا
خواہشیں کیوں نہیں مَری میری
وہ ثمن دیکھ ہی نہیں پایا
آنکھ میں جاگتی نمی میری

مدثر ثمن/ ملتان

اِک شخص ہے رفیق سفر کیا گِلہ کریں
مِلتا نہیں مزاج مگر کیا گلہ کریں
کرتی تو ہے مسافتِ دل طے کسی طرح
کانٹوں بھری ہے راہ گزر کیا گلہ کریں
تلوار اس نے رکھی نہیں ہے نیام میں
کٹتے ہوں لاکھ قلب و جگر کیا گلہ کریں
آدھی گواہی اپنی ہے ایوانِ عدل میں
اور پورا ہے وجود مگر کیا گلہ کریں
مریم مکین اور وہ مالک مکان ہے
اپنے نہیں یہ بام، یہ در کیا گلہ کریں

مریم رانا/ لاہور

دیکھا ہے جب سے یار کو بشری لباس میں
کرتے بیاں ہیں بات کو ہم اقتباس میں

کیوں بحر و دشت چھانتا ہے اُس کی کھوج میں
ملتا ہے جب بھی، ملتا ہے وہ آس پاس میں
ہر چہرہ اس کی ذات کی لگتا نمود ہے
ہے آنکھ اپنی جھک گئی اک التماس میں
جاتی ہے اُس کی سمت تو آتی ہے واپسی
حیران ہے نگاہ اِسی انعکاس میں
من میں ہے وہ تو من سے ہے باہر بھی اُس کی ذات
ہلکا سا اک حجاب ہے لیکن شناس میں
ہے شش جہات میں، ہمیں ملتا وہ بے جہت
جیسے کہ انطباق ہو اک ہی حماس میں
صابر قریب لگتا ہے اب وقتِ وصل یار
حدّت جو بڑھتی جاتی ہے اِس دل کی پیاس میں

صابر انصاری/ ملتان

نظمیں

بنگالن

وہ لاٹھی کو تھامے چورا ہے پہ حسرت کی
تصویر بن کر پریشاں کھڑی تھی
وہ عورت بوسیدہ عمارت تھی جیسے
عمارت کہ جس کی دیواروں پہ لکھی
عبارت عیاں تھی
کہاں سے چلی اور پہنچی کہاں تھی
کبھی اُس کو سکوں میں تولا گیا تھا
خریدا گیا تھا
وطن سے کہیں دور دوجے وطن میں
بسایا گیا تھا
رلایا گیا تھا
ڈرایا گیا تھا
بہت لطف اس سے اُٹھایا گیا تھا
وہ عورت بوسیدہ عمارت کہ جس کی
دیواروں کے روزن کھلے تھے
مگر روشنی کا وہاں پر نشاں تک نہیں تھا
کسی آرزو کا گماں تک نہیں تھا
وہ لاٹھی کو تھامے چورا ہے پہ چپ چاپ
رقص جہاں دیکھنے میں مگن تھی
وہ اپنے وطن سے بہت سال پہلے بچھڑ تو چکی تھی
مگر اُس کی یادوں کے تنکوں کو چن کر
تخیل کی چڑیوں نے دونوں ہی آنکھوں میں
جن گھونسلوں کو بنایا ہوا تھا
وہ گرنے لگے تھے
تخیل کی چڑیاں سے کا چڑی مار لے جا چکا تھا
وہ تنکے بہت ہی بہت ہی پرانے
نہ آنکھوں میں آنسو نہ شکوے لبوں پر
بوسیدہ عمارت لرزنے لگی تھی
تھکی ہاری آخر وہ گرنے لگی تھی
تمام عمر جس کی مشقت بھری تھی
جب انسانیت کی عمارت گری تھی
تو لوگوں نے سمجھا بنگالن مری تھی۔۔۔

احمد نعیم ارشد

آنکھ روتی ہے

ہماری آنکھ روتی ہے
تمہارا فون آنے میں
کبھی جو دیر ہوتی ہے
بہت محسوس ہوتا ہے
ہماری آنکھ روتی ہے
ہماری جاں نکلتی ہے

صبا ممتاز بانو

آپ بیتی

شام وسحر کے درمیاں

رئیس عباس زیدی

سحر/دوسری قسط

لائلپور کیمپ سے لوکل سیّد زمیندار غلام عباس شاہ ان مہاجر سادات کو چک ۳۱۴ ج ب لے گئے۔ جانے والے سکھ سردار کی حویلی کو بیوہ گھر بنا دیا گیا۔ باقی سب نے کچے مکان بنائے۔ بڑے سے احاطہ میں کچا مکان۔ کھانے پینے کی ہر شے کی بہتات۔ باہر چھپر میں دو بھینسیں۔ صبح لسی لینے والوں کی قطار لگتی۔ صبح کو ابا تہجد کے لیے اُٹھتے۔ ہینڈ پمپ چلا کر وضو کے لیے پانی نکالتے۔ ہم کچی نیند میں اُن کے منہ سے شیخ سعدی کی کریما سنتے:

کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

گاؤں والوں نے تمام کتابیں اکٹھی کر کے حویلی کے ایک کمرے میں پھینک دی تھیں۔ پہلی کے قاعدہ کے بعد جو کتاب اس ڈھیر سے ہاتھ لگی وہ ٹیگور کی کہانیاں' تھی۔

ایک مسجد بنائی اور رہنے لگے۔ اس گاؤں میں یا تو لوکل جاٹ تھے یا پھر یہ مہاجر سیّد لیکن ان کا آپس میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ ایک ان لکھا معاہدہ امن ابھی قائم ہے۔ عزت کا پہلا تجربہ کچھ یوں ہے کہ شاید تین چار سال عمر ہوگی، جاٹوں کے سفید داڑھیوں والے بوڑھے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، شاہ جی آ گئے اور اُٹھا کر چارپائی پر بٹھا دیا۔

دو نہروں کے درمیان ایک خوبصورت سا گاؤں ہے۔ ان دو نہروں کو ایک کو چھوٹی نہر اور دوسری کو بڑی نہر کہتے ہیں۔ راقم الحروف نے ابتدائی بچپن میں انہی نہروں میں تیرنا سیکھا۔ نزدیک ترین ریلوے اسٹیشن ''پکا انا'' اور نزدیک ترین بس اڈہ ''نواں لاہور'' ہے۔ ایک چھوٹا سا سکول جس کا ایک کچا کوٹھا بڑا سا صحن بغیر چار دیواری کے ٹاٹ بھی نہیں تھے۔ گھر سے گندم کی خالی بوری لے جاتے، جھاڑ کر اُس پر بیٹھتے۔ ماسٹر صاحب بڑے Environmentlist تھے۔ حکم ہوا ہر بچہ دو شیشم کے درخت سکول کے گرد لگائے۔ جس کا پودا سوکھ گیا اُسے دو ڈنڈے پڑیں گے۔ لہٰذا ہم اپنے درخت کی تندہی سے حفاظت کرتے اور پانی دیتے۔ آج یہ تن آور سایہ دار درخت ہیں۔ راقم نے یہ تجربہ بطور ڈپٹی کمشنر اور بطور منتظم شیخ زید پبلک سکول دُہرایا۔ محکمہ جنگلات نے معاونت کی اور ہر بچے کے نام کی تختی کا درخت کے ساتھ اضافہ کیا۔ ایک دن میں ساڑھے سات سو درخت لگے۔ سنہری بالوں، سرخ ربن والی، یونیفارم پہنے وہ ننھی بچی کبھی نہیں بھولے گی۔ جو ''تحریم زہرہ'' کی تختی اُٹھائے دوسرے ہاتھ میں شہتوت کا پودہ لیے بھاگی جا رہی تھی۔

سکول میں ایک بار دورے پر ڈپٹی کمشنر بہادر تشریف لائے۔ راستے بھر میں چھڑکاؤ ہوا۔ گھر سے کروشیے سے کڑھے میز پوش اور چائے کے برتن سکول پہنچائے گئے۔ ہم نے گھوڑے پر سوار صاحب بہادر کو سلامی اور P.T کر کے دکھائی۔ ایک اور باوردی گھڑ سوار فاصلے پر ذرا سا پیچھے تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ یہ ضلع کا پولیس کپتان ہے۔ بڑے مرعوب ہو کر پوچھا یہ ڈپٹی کمشنر بہادر اور پولیس کپتان کیسے بنتے ہیں۔ جواب ملا ایک امتحان دینا پڑتا ہے۔ مصمم ارادہ کر لیا کہ یہ امتحان دینا ہے اور اُس دن خوب مل مل کر پہاڑے یاد کیے۔ کمپیوٹر اور کلکولیٹر زدہ بچے جوان مشینوں پر بھی خاصی دیر میں ضرب تقسیم کرنے کے قابل ہوتے ہیں ہم جیسے اڑھائی اور سوائے کا پہاڑہ رٹنے والے لوگ چند لمحوں میں زبانی جواب بتا کر سرخرو ہو جاتے ہیں۔ پہاڑے رٹتے ہوئے چھٹی کا وقت ہو جاتا۔ سکول میں کلاک نام کی کسی چیز کا تصور ہی نہیں تھا۔ زمین پر ایک لکیر کھود رکھی تھی کہ دھوپ یہاں تک پہنچے گی تو چھٹی ہو جائے گی۔ لہٰذا دھوپ وہاں تک پہنچتی تو ہم لوگ گھروں کی سمت بھاگ اُٹھتے۔

ابا نہایت ہی سیدھے، سادہ، معصوم سے فرشتہ سیرت انسان تھے۔ کلیم، یونٹ، محکمہ بحالیات سیٹلمنٹ کے چکر اُن کی سمجھ میں نہیں آئے۔ جانے کون سی ریاضی استعمال کر کے تھوڑی سی زمین انہیں تھما دی گئی تھی۔ وہ اُس پر صبر شکر کر کے بچوں کی تعلیم پر متوجہ ہو گئے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد بھی لوگ جعلی علی اکبر زیدی بن کر اُن کے یونٹوں پر زمینیں الاٹ کروا کر لے جاتے رہے۔

ایک دن ابا جی زمین سے مغرب کے وقت گھر واپس آ رہے تھے کہ جھاڑیوں سے چھپے ہوئے چند مسلح افراد پر نظر پڑی۔

رُک کر پوچھا ''بھئی! آپ کون لوگ ہیں؟''

''بابا جا اپنا کم کر''

''نہیں بھئی! آپ لوگ یہاں اندھیرے میں کیا کر رہے ہیں؟''

''بابا ہماری جان چھوڑ دو۔ جاؤ اپنے کام سے کام رکھو۔''

''نہیں بھئی! آپ آخر یہاں کیا کر رہے ہیں۔''

''ہم ڈاکو ہیں۔ ڈاکہ ڈالنے کے لیے بیٹھے ہیں۔'' ان کے سردار نے چڑ کر کہا۔

''بھئی! یہ تو کوئی اچھا کام نہیں ہے۔'' ابا نے کہا۔

اُس زمانے میں کلاشنکوف ابھی نہیں آئی تھی۔ ڈاکو فقط چھویوں اور گنڈاسوں سے مسلح ہوتے تھے۔ آخر کار ڈاکوؤں کے سردار نے زچ ہو کر پوچھا کہ ''وہ کیا کام کر سکتا ہے۔ اُسے کون کام دے گا؟''

ابا نے کہا کہ ''وہ اپنی زمین اُسے بطور مزارع دینے پر راضی ہیں''

اور یوں ''گھنا کوڈھن'' آئندہ بیس پچیس سال کے لیے ہمارا مزارع بن گیا۔ ابا نے اُس کی شادی کی۔ اُس کی پہلی بیٹی ''ستاں'' بہنوں کے ساتھ کھیلنے اکثر گھر آتی۔

بھائیوں کی نوکریاں لگتیں تو خاندان کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ بھائی نفیس جوئیہ بنگلہ اور ورسیں لے گئے۔ بھائی انیس منٹگمری لے گئے جو وہاں ایس ڈی او ہو گئے تھے۔ بعد ازاں جنرل منیجر واپڈا ریٹائر ہوئے۔ منٹگمری رائے احمد کھرل اور داد فتیانہ کی سرزمین ہے۔

بجلی گھر نہر اور کراچی پشاور روڈ کے کنارے خاردار تاروں کی حدود میں خوبصورت سی بستی تھی۔ ایک ریلوے لائن بھی پاور ہاؤس کے اندر آتی جو کوئلہ لاتی۔ ہیڈ مالی بشیر نے یہ کالونی خوبصورت پھولوں سے سجا رکھی تھی۔ اتنے سارے پھول زندگی میں پہلی بار دیکھے۔ ہولی فلاکس، پیزی، گیندا، گل اشرفی، گل داؤدی اور بوگن ویلیا کی بیلیں۔ اتوار کے دن کرکٹ میچ باقاعدہ کھیلا جاتا۔ ایسر اور مہندی کی باڑیں۔ گھر کے سامنے خوبصورت گول لان تھا۔ بیری کا درخت جس پر کھٹے میٹھے بیر لگتے۔ سکول جانے کے لیے لوئر باری دوآب کینال کا پل پار کرنا پڑتا۔ یہ پل پیرس میں دریائے سین پر بنے مرکزی پل کی سو فیصد نقل ہے۔ اُس وقت معلوم نہیں تھا کہ اس شہر میں ناصر کاظمی اور مجید امجد خوبصورت شاعری کر رہے ہیں۔ ناصر کا دل جب اُداس ہوتا تو یہی شہر سائیں سائیں کرتا۔ مجلس میلاد میں گھر والے ناصر کے گھر جاتے۔

پھر ساون رُت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے

پھر کاگا بولا گھر کے سونے آنگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے

اسی شہر میں ۲۷ راکتوبر کی شام ریڈیو پر اعلان سنا کہ ایوب خاں نے مارشل لا لگا دیا ہے۔ گھر میں دو رسالے باقاعدگی سے آتے تھے۔ قندیل اور لیل و نہار۔ ان دونوں رسالوں کے مرکزی صفحات پر ادبیات عالیہ کی تلخیص ہوتی۔ تیسری جماعت کا یہ بچہ، بچوں کا صفحہ پڑھنے کے بجائے ادبیات عالیہ کی تلخیص پڑھتا۔ ٹالسٹائی، میکسم گورکی، چیخوف، سمرسٹ ماہم اور موپساں کی کہانیاں اور ناولوں کی تلخیص۔ کچھ لفظوں کے معنی پوچھنے پر بڑوں سے ڈانٹ پڑتی۔ چوتھی جماعت میں الف لیلیٰ ہزار داستان ختم کر لی۔ مرجینا، علی بابا چالیس چور، الہ دین کا چراغ اور زنبیل عمرو عیار اور قصے سوتے جاگتے کا:

''تو بتا چارہ گر تیری زنبیل میں نسخہ کیمیا محبت بھی ہے؟''

سکول میں معاشرتی علوم کی نصابی کتاب میں ہندوستان کے قدیم باشندے موہنجو داڑو اور ہڑپہ کے شہروں پر آریاؤں کے حملے۔ ہندوستان کے قدیم باشندے اشوک اعظم، کنشک سکندر اعظم کا حملہ پھر چندر گپت موریہ سے دہلی کے سلاطین، آگرہ کے مغلوں سے لے کر ایوب خان کے سنہری انقلاب کی برکتیں تک نصاب تھا۔ پھر نصاب سکڑتا گیا۔ آج کل اے لیول اور او لیول کے بچے......

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

پھر ایک دن بھائی کا تبادلہ ملتان ہو گیا۔ سول استھان گہ ایک قدیم تہذیب کا مرکز اور قدیم شہر۔ حضرت بہاؤالدین ذکریا جب ملتان تشریف لائے شہر کے باہر پڑاؤ کیا تو شہر کی بزرگ ہستیوں نے ایک دودھ سے لبالب پیالہ آپ کی خدمت میں بھجوایا کہ یہاں آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اُس پیالہ میں ایک گلاب کی پتی ایسے تیرا دی کہ ایک قطرہ بھی دُودھ نہ چھلکا اور وہ پیالہ واپس بھجوا دیا۔ اُن کے پوتے شاہ رکن الدین عالم کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ دہلی محمد تغلق جسے تاریخ میں دانا بیوقوف کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، نے اپنے لیے قبل از مرگ تین مزار دہلی، آگرہ اور ملتان میں بنوائے تھے۔ اہل ملتان نے بادشاہ سے گزارش کی اور اپنے محبوب صوفی بزرگ کو بادشاہ کے عالی شان مقبرے میں دفن کروا دیا۔ ملتان ہی میں شاہ شمس تبریز کا مزار ہے جو ایک روایت کے مطابق مولانا روم کے مرشد ہیں۔ جن کی ''قم باذنی'' کہنے پر کھال کھنچوا دی گئی تھی اور ایک روایت کے مطابق انہیں کے حکم پر ملتان میں سورج سوا نیزے پر اُتر آیا تھا۔

واپڈا کے پیراں غائب پاور ہاؤس کی کالونی ایک بہت خوبصورت بستی جس میں دو کلب ایک سوئمنگ پول، ٹینس کورٹس، کرکٹ کا گراؤنڈ، فٹ بال کا گراؤنڈ بھی کچھ تھا۔ واپڈا کی سکول بس شہر لے کر جاتی جس میں ہم گاتے بجاتے ملتان شہر پہنچتے اور اپنے اپنے سکولوں کے قریب اُتر جاتے۔

اس سکول بس کے صدقے۔ انتہائی بچپن میں دو عظیم ہستیوں کو سننے کا موقع ملا۔ خطابت کے فن میں تین نام بہت مشہور ہیں۔ نواب بہادر یار جنگ، عطاء اللہ شاہ بخاری اور شورش کاشمیری۔ ایک دن عام خاص باغ کے باہر بس کے انتظار کرتے ہوئے دیکھا کہ ہزاروں کا مجمع ہے۔ اس قدر خاموشی کہ سکوت کا عالم۔ اسٹیج پر ایک سرخ سفید چہرے والے

بزرگ تقریر فرما رہے ہیں۔

بستہ سنبھالتے ہوئے کسی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "یہ کون ہیں؟"

مخاطب نے تقریباً ڈانٹ کر کہا "انہیں نہیں جانتے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں"

شورش کاشمیری کو یونیورسٹی کے زمانے میں موچی دروازہ میں سننے کا بارہا موقع ملا۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

ایک بار اسی بس کا انتظار کرتے ہوئے ایوب سٹیڈیم ملتان میں جسٹس رستم کیانی مرحوم کو سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کی اور باتیں تو آٹھویں جماعت کے بچے کی سمجھ میں کیا آتیں لیکن ایک بات اب تک یاد ہے۔

کہہ رہے تھے "لوگو! مجھے جوتوں کے تسمے باندھنے نہیں آتے۔ جب میری ماں زندہ تھی تو وہ میرے تسمے باندھا کرتی تھی۔ میری ماں مرگئی ہے دیکھو آج بھی میرے جوتوں کے تسمے کھلے ہیں۔" انہوں نے اپنے جوتوں کے تسمے کھلے دکھاتے ہوئے کہا۔

"اور حکومتیں سبز باغ دکھاتی تھیں۔ یہ حکومت کالا باغ دکھاتی ہے"۔

یہ غالباً ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔ بعد میں اُن کی کتابیں "Half truth, not whole the truth اور افکار پریشان پڑھنے کا موقع ملا۔

مسلم ہائی سکول ملتان میں ہیڈ ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب ایک "لیجنڈ" تھے۔ انہوں نے سیاسی اور ادبی شعور طلباء میں پیدا کیا۔ کوئی بڑا واقعہ ہوا۔ پورا سکول دھوپ میں گراؤنڈ میں اکٹھا کرلیا جاتا۔

"بچو! پاکستان میں پہلے ہی قحط الرجال ہے۔ آج محمد علی بوگرہ بھی ہم سے جدا ہوگئے۔"

قحط الرجال کا مطلب بہت بعد میں سمجھ آیا۔ سکول میں ٹیپو سلطان سٹیج ڈرامہ ہوا۔ سلطان شہید کی ذات سے اُسی ادارہ میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ شیر میسور، حریت کا مجاہد، غلامی کے راستے میں آخری دیوار، سرنگا پٹم کے اُن مردِ حُر کے بارے میں جتنا بھی جانو اُن کا احترام بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ سلطان شہید ایک ایسے شہید ہیں جن کی شہادت اُن کے انتقال کے بعد بھی جاری رہی کہ انگریز افسروں نے اپنے کتوں کا نام "ٹیپو" رکھا جس کے جواب میں مسلمانوں نے اپنے کتوں کے نام "آتھر" اور "ولزلے" رکھے۔

یہ سیلِ اشک مجھے گفتگو کی تاب تو دے
جو یہ کہوں کہ وفا کا مری حساب تو دے
یہ خامشی تو قیامت کی جان لیوا ہے
وہ دل دکھائے مگر بات کا جواب تو دے
نہیں نہیں میں وفا سے کنارا کش تو نہیں
وہ دے رہا ہے مجھے ہجر کا عذاب تو دے
یہ دیکھ کس گلِ تر پہ نگاہ ٹھہری ہے
نہ دے وہ پھول مجھے داد انتخاب تو دے
بھری بہار رتوں میں بھی خار لے آئی
یہ انتظار کی ٹہنی کبھی گلاب تو دے
جو میں ہوں دور تو کیا، یہ ادھر سے گزرا ہے
خبر مجھے مرے پیاروں کی ماہ تاب تو دے
گناہ گار سہی پھر بھی میرے حصے کا
تری طرف جو نکلتا ہے وہ ثواب تو دے
تری دلیل اُسے لاجواب کر دے گی
مگر زبان کے نشتر کو پہلے آب تو دے
ہر ایک واقعہ تاریخ وار لکھ جاؤں
گئے دنوں کی مرے ہاتھ وہ کتاب تو دے
کہوں تو کیسے غزل، ایک لمحۂ فرصت
مجھے یہ دردِ دلِ خانماں خراب تو دے

ڈاکٹر صبیحہ صبا/امریکہ

تم جو آئے تو ہمیں اپنا پتا یاد آیا
وہ نشیمن جو ہمارا نہ رہا ، یاد آیا
چاند نکلا تو وہی داغِ وفا یاد آیا
پھول مہکے تو وہی زخم ہرا یاد آیا
یاد آیا ہے تمہیں دیکھ کے دیوانہ وہی
ہاں وہی قیس ، وہی آبلہ پا یاد آیا
تم نے دورانِ تکلم یوں ہی اک نام لیا
ہم کو اس نام پہ کیا جانئے ، کیا یاد آیا
جس کو اک بار بھلانے کی قسم کھائی تھی
زندگی بھر وہ ستم گر یہ خدا یاد آیا
کیا کلائی کو سجائیں جو یوں ہی ٹوٹ گئیں
چوڑیوں پہ ترا پیمانِ وفا یاد آیا
میرا اصرار کہ بس مجھ کو صبیحہ کہنا
اور ضد میں ترا کہنا وہ صبا یاد آیا

ڈاکٹر صبیحہ صبا/امریکہ

....

نکہتِ گل جہاں جہاں بھی گئی
میری خوشبوئے داستاں بھی گئی
الفتِ یار مہرباں بھی گئی
اور وہ خوئے دل ستاں بھی گئی
چشمِ پُرنم کی بے نقابی سے
آبروئے غمِ نہاں بھی گئی
اب وہ پہلا سا دل نہیں دُکھتا
پہ طبیعت، وہ شادماں بھی گئی
عہدِ رفتہ، ترے جمال کے ساتھ
وہ طبیعت مری رواں بھی گئی
میری محفل سے ان کے اُٹھتے ہی
بزمِ انجم سے کہکشاں بھی گئی
لوگ اپنی ہی داستاں سمجھے
یہ کہانی مری جہاں بھی گئی
دیکھ کر بے دلی ہم نفساں
خوش بیانیِ قصہ خواں بھی گئی

ڈاکٹر صبیحہ صبا/امریکہ

....

پانچ منٹ

فوزیہ بھٹی/لاہور

یار وکیل۔۔۔!یہ ادارہ بن جائے گا نہ۔۔۔!

ہاں۔۔۔!بن جائے گا مگر بڑی عجیب سی بنیاد ہے اس کی۔۔۔!

قبرستان میں اپنی ماں کی قبر پر قریباً تین گھنٹے بیٹھے رہنے سے میری ٹانگیں اکڑ چکیں تھیں۔سردیوں کی جلدی ہونے والی شام اور بہت جلد چھا جانے والی رات ہر طرف پھیل چکی تھی۔میرے ذہن میں میرے وکیل دوست کی بات گونج رہی تھی۔حسب معمول ماں کی قبر پر آج بھی خالی ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔جب سے ماں جی گئیں ہیں میں یونہی روز یہاں آجایا کرتا ہوں۔بیٹھتا ہوں۔۔۔سوچتا ہوں۔۔۔ماں سے بات کروں مگر یہاں آتے ہی سوائے ماں کے، ہر بات یاد رہ جاتی ہے۔پتہ نہیں کیوں سوائے ماں کے ہر بات میرے ذہن پر ہتھوڑے مارتی رہتی ہے۔راستے میں آتے وقت کسی سائیکل سوار کا چہرہ،لوکل روٹ پہ چلنے والی بھدی بسوں کے سماع خراش ہارن، کسی بھی گاڑی کی نمبر پلیٹ، قبرستان کے چوکیدار کی مٹی میں سنی ہوئی چپل۔۔۔یہ سب مجھے یاد آنے لگتے ہیں۔یہ وسوسے بھی نہیں ہیں کہ مجھے میری ماں کی قبر پر بیٹھ کر غم منانے سے روکا جا رہا ہو، نہ میری ماں پیر پیغمبر تھی۔۔۔پھر کیوں میرا ذہن بھٹک بھٹک جاتا ہے؟؟؟ایسا کیوں ہوتا ہے؟

دنیا کی ان تمام باتوں کو رد کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتا ہوا میں غائب دماغی سے کسی معمول کی طرح اٹھتا ہوں اور اپنی اکڑی ہوئی ٹانگوں سے کچھ چٹخنے کی آواز سنتے ہوئے اپنے قدموں کو محسوس کرتے چلنے لگتا ہوں۔ان چند لمحوں میں صرف اور صرف اپنے قدموں کو محسوس کرنا مجھے بے حد مشکل مگر بیچ میں انتہائی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔بہت بار ایسا محسوس ہوتا ہے میں اپنے جسم کو پہچانتا نہیں ہوں صرف ذہن اور دماغ سے جڑی کچھ رگیں میرے وجود کا حصہ بن کر رہ جاتی ہیں اور باقی بچا کھچا وجود ہوا میں ہلکورے لیتا رہتا ہے۔

قبرستان کا گیٹ پار کرتے ہی دنیا کی ہر یاد ہر بات میرے ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔۔۔اور۔۔۔ صرف "ماں" یاد رہ جاتی ہے،اس قدر یاد رہ جاتی ہے کہ مجھے ان کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں دکھائی دینے لگتیں ہیں۔ان کی ایک کلائی میں بھاری سونے کا کڑا اور دوسری میں چوڑیاں ہوا کرتیں تھیں،کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اب بھی وہ روٹی بیل رہی ہوں اور ان چوڑیوں کی ہلکی ہلکی آواز کہیں بہت قریب سے آرہی ہو۔حالانکہ ان کی زندگی میں تو میں ان کے قریب کبھی نہیں رہا بس کسی اچھے ہمسائے کی روز کی سلام دعا ہو جاتی تھی۔اتنا یاد ہے کہ وہ مجھے بہت غور سے دیکھا کرتی تھیں جیسے نظر بھر کر دیکھتے ہیں ویسے ہی۔شاید وہ میرے چہرے پر کچھ کھوجتی رہتیں تھیں۔ان کی آنکھیں میرے طواف میں رہتیں تھیں مجھے لگتا تھا کہ ان کی نظریں دعا کا حصار تھیں۔باقی رہی رات کو دیر سے آنے پر تازہ روٹی پکانے والی ماں یا باپ کی ڈانٹ سے بچانے والی ماں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔میرے گھر میں سب ٹھیک ٹھیک چلتا تھا۔بیٹے کے لئے کوئی خاص اقربا پروری کے اصول رائج نہیں تھے!!! ہاں میری دونوں بہنیں ان کے بہت قریب رہی تھیں۔

اب بھی جب کبھی وہ مجھ سے ملنے آتی ہیں تو اماں کی بہت سی باتیں کرتی ہیں۔کبھی کوئی پرانا قصہ چھیڑ دیتی ہیں۔بہت کچھ بتاتی ہیں پر پتہ نہیں کیوں مجھے ان کی ہر بات بہت اوپری اوپری سی محسوس ہوتی ہے۔مجھے لگتا ہے کہ وہ دونوں ماں کو صرف ماں سمجھتیں رہیں، جبکہ میں ان کو ایک شخصیت کے طور پر دیکھتا رہتا ہوں جیسے کسی مکمل انسان کو دیکھا اور سوچا جاتا ہے۔اس کے بعد یہ سوچ کر کہ میں نے تو انہیں بہت عرصے کے لئے غیر ضروری سمجھا تھا! شرمندہ سا ہو جاتا ہوں۔کیا اپنے باپ یا ماں کو انسان سمجھنا غلطی ہے؟؟؟ کیا انہیں صرف انسان سمجھنا اور فار گرانٹڈ نہ لینا غلطی ہے؟

میرا مطلب ہے کہ۔۔۔اوہو پتہ نہیں میرا کیا مطلب ہے۔۔۔ایسا نہیں ہے کہ ان سے بدتمیزی کرتا تھا یا ان کو برا بھلا کہتا تھا۔میرا مسئلہ یہ تھا کہ ماں مجھے ساری زندگی نظر تو آئی مگر محسوس نہیں ہوئی۔محسوس جیسے۔۔۔اممممم۔۔۔گھر میں دفتر میں ساری چیزیں اپنی جگہ بالکل ٹھیک اور صحیح ڈائریکشن میں پڑی ہوئی ہوں تو ہم ان کو دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔۔۔جس طرح روز صبح ہوئی ہی ہوتی ہے ہم صبح کو دیکھ کر چونکتے نہیں۔۔۔کیا چونکتے ہیں؟ جیسے رات آئی ہوتی ہے ہم رات کے آنے پر حیرت کا اظہار نہیں کرتے۔۔۔کیا حیرت کا اظہار کرتے ہیں؟ نہیں نا نہیں

کرتے بھی۔ پی تلی چیز یں ہیں۔۔۔قانون فطرت۔تو ٹھیک ویسی ہی چادر والی ماں چپ چاپ سی ماں۔۔۔جس کے پاس رشتے دار ہی رشتے دار نظر آتے ہوں۔ ایسی ماں جو کبھی پراٹھے پکوانے اور کبھی قالین دھلوانے میں کبھی نئے پردوں کے رنگ چننے میں مصروف ہو۔کبھی دو لوگوں کا جھگڑا نمٹانے اور کبھی کسی ساس یا بہو کی داستان ناگواری سے سنتے ہوئے گھر کے نوکروں کو ساتھ ساتھ کام جاری رکھنے کی ہدایت بھی دیتی جا رہی ہو۔ سردی گرمی خزاں بہار صرف سفید رنگ یا بغیر پرنٹ ڈیزائن کپڑے پہننے والی ماں۔ جسے فیشن سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں مگر باتیں بہت کھلے ذہن اور اونچے معیار کی۔ خدا کی قسم!!! مجھے تو اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ میری ماں کتنا پڑھی ہوئی تھی ہاں ان کے جانے کے بعد احساس ہوا وہ ہر جملے میں صحیح انگریزی کا کوئی نہ کوئی لفظ ضرور استعمال کرتی تھیں،اخبار پڑھتی تھیں۔

مرنے سے پہلے گھر میں ہر جگہ بکھری ہوئی ماں مجھے کبھی نظر نہیں آئی۔ان کے مرنے کا افسوس بھی مجھے واجبی سا ہی تھا۔ میں رویا بھی تھا کہ سب کو دیکھ کر مجھے رونا آ جاتا تھا۔ میری عمر بھی تو بس 22 برس تھی۔ خیر سوچتے سوچتے گھر پہنچ گیا ہوں۔ گھر میں صرف ایک نوکر اور چند بلیوں کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا ہے۔

گاڑی لاک کر کے لان سے گزرتے ہوئے مجھے ماں کا دوپٹہ لہرانے کا گمان ہوتا ہے چونکہ ایسا روز ہوتا ہے تو اب میں چونکتا نہیں ہوں ۔ سردی گرمی ہو یا بارش ماں کی کرسی کی مخصوص جگہ بدلنے نہیں دیتا ہوں حالانکہ موسمی اثرات کی وجہ سے کرسی کئی بار بدلی جا چکی ہے مگر ہر نئی کرسی ٹھیک اسی رخ اور طریقے سے رکھ دی جاتی ہے جیسے پہلے پڑی ہوئی تھی۔

نیم اندھیری راہداری سے گزرتے ہوئے میں اپنے کمرے میں آ گیا ہوں۔ کپڑے بدلتے ہوئے میں مسلسل اسی ادارے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ادارہ کیا ہے بس میرا دل چاہتا ہے کہ دنیا کی تمام مائیں تمام اچھی مائیں ایک چھت کے نیچے رہنے لگیں وہ جن کے بچے ان کو توجہ، محبت نہیں دے سکتے وہ تمام مائیں چھوٹے چھوٹے دکھوں سے بچنے کیلئے وہاں آ کر رہیں۔ اب میرا وکیل دوست کہتا ہے کہ مجھے کسی چیز کا گلٹ ہے جو مجھے یہ سب کرنے پر اکسا رہا ہے۔ گلٹ تو خیر کیا ہوتا ہے کیا میری سوچ اچھی نہیں ہے؟؟ میں بیسویوں بار اس سے پوچھتا ہوں اور درجنوں بار کہتا ہوں کہ یار ماں بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے یوں ضائع کرنے کی نہیں کہ ایک کونے میں رکھ دی جائے۔

پھر وہ بحث کرتا ہے کہ میں denial phase میں پھنس گیا ہوں۔

میری ماں تو بڑی جی دار اور دبنگ قسم کی عورت تھی۔ کسی کی جرأت نہیں تھی سمیت ابا جی کے کہ ان کے سامنے کچھ کہہ سکیں سب عرض ہی کیا کرتے تھے ان کے سامنے تو مجھے کیسا گلٹ بھلا۔۔؟ میں تو ان بدبخت اولادوں کے شکنجے سے ان ماؤں کو چھڑانا چاہتا ہوں جو خود بھی وہاں سے نکلنا چاہتی ہیں۔ اب اتنا پیسہ ساتھ لے کر نہیں جانے والا قبر میں۔!

ہاں قبر سے یاد آیا کہ ماں جی کے ساتھ والی قبر کی جگہ اپنے لیے لے کر رکھ چھوڑتا ہوں۔ میں نے اپنے موبائل پر متعلقہ شخص سے بات کرنے کے لئے الارم لگایا۔ میں چونکہ ہر کام سسٹیمیٹکلی کرتا ہوں تو میرے فون پر کافی الارم لگے رہتے ہیں۔

بہر حال۔۔!

سارا دن میں بھاگ دوڑ میں تھک سا جاتا ہوں مگر رات ہوتے ہی میرا ذہن مکمل بیدار ہو جاتا ہے سوچتا ہوں کیا کھویا اور کیا پایا ہے برسوں سے تنہا ہونے کے باوجود اب بھی جب میرے آنسو تکیے میں جذب ہوتے ہیں تو نظر چرا کر ادھر اُدھر دیکھ لیتا ہوں مبادا کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔

میں سوچتا ہوں برس ہا برس سے ماں کی قبر پر گھنٹوں بیٹھے رہنے سے بھی میری تشنگی جاتی نہیں ہے۔شاید وکیل ٹھیک کہتا ہے کہ مجھے گلٹ ہے اگر ماں کے کہنے پر اس دن بیٹھ کر ان کی بات سن لی جاتی تو زندگی شاید آج بہت مختلف ہوتی۔ اس ایک بات نہ سننے کی سزا شاید میں اپنے آپ کو دیتا چلا جا رہا ہوں۔

ماں کی سوالیہ نظریں اس طرح میرے وجود میں گڑھ گئیں ہیں کہ میں اپنی شادی شدہ زندگی بھی 4 ماہ سے زیادہ نہیں چلا پایا۔ عطرت کی سوالیہ نظریں مجھے خوف میں مبتلا کر دیتیں تھیں اور مجھے لگتا تھا کہ بس اگر کہیں کچھ ہو گیا کہیں کچھ غلط ہو گیا تو کیا کروں گا۔ وہ بے چاری بھی مجھے ذہنی مریض سمجھتے ہوئے روتی دھوتی یہاں سے چلی گئی میں بھی تو حد کر دیتا تھا۔ وہ جب بھی وقت مانگتی میں اس کے پاس بیٹھ تو جاتا تھا مگر میرا دماغ میرا وجود جیسے سُن ہو جاتا تھا ماں کی آواز کہ ”کبیر 5 منٹ کے لئے میری بات سن لے“ مجھے اپنے حصار میں لے لیتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں نے اب زندگی میں کسی کو وقت دیا تو یہ ماں کے ساتھ دھوکہ ہوگا۔ اس ایک جملے کا ادراک مجھے ماں کے مرنے کے ٹھیک پانچ سال بعد ہوا تھا۔ جیسے جیسے میری

عمر بڑھنے لگی مجھے یہ خیال ہوا کہ ماں میرے اندر زندہ ہوتی جا رہی ہے ماں کی آنکھوں کا رنگ تک مجھے یاد آ گیا تھا۔ جب ماں نے مجھ سے کہا تھا کہ ''کبیر 5منٹ کے لئے میری بات سُن لے'' تو تب بھی کسی رشتہ دار عورتوں کے درمیان گھری بیٹھی تھی۔ میں نے جی اچھا۔۔۔! کہہ کر صحن کی طرف قدم بڑھا لیے تھے۔اس کے بعد ایک ہفتے میں ہی ماں ختم ہو گئی۔تب تو احساس نہیں ہوا مگر سالوں بعد یاد کے ہلکے ہلکے جھونکے مجھے چھیڑنے لگے۔ اس ایک ہفتے میں، میں ماں کے قریب سے کئی بار گزرا تھا اب یاد آتا ہے کہ ماں میری طرف غور سے دیکھتی تھی شاید وہ اس انتظار میں تھی کہ میں اپنی Good For Nothing معروف زندگی میں سے انہیں پانچ منٹ دے دوں۔ نجانے وہ کیا بات ہو گی جو ماں مجھ سے کہنا چاہتی تھی۔۔۔ پتہ نہیں شاید ماں مجھے یہ کہنا چاہتی ہو کہ انہیں کوئی ضرورت تھی۔۔۔یا شاید ماں مجھے یہ بتانا چاہتیں ہوں کہ میں ان کی سب سے خاص اولاد ہوں۔۔۔یا شاید ماں یہ کہنا چاہتیں ہوں کہ ماں کو مجھ سے بہت محبت تھی۔۔۔اگر خود سے جھوٹ نہ بولوں تو میں ماں کی قبر پر جاتا بھی اس لئے ہوں کہ شاید وہاں مجھ پر کوئی وحی اتر آئے گی اور مجھے وہ بات پتہ چل جائے گی۔ میرا کانسنٹریشن Span اتنا کم ہو چکا ہے کہ زیادہ چیزوں پر توجہ نہیں دے پاتا، فوکس نہیں کر پاتا، کاش وہ پانچ منٹ دوبارہ میری زندگی میں آ جائیں پانچ لاکھ منٹ بھی ماں کی قبر پر گزارنے کے بعد ان پانچ منٹ کا ازالہ مجھ سے نہیں ہوتا۔وقت گزرنے کے احساس سے مجھے اتنی دحشت ہوتی ہے میں تو اب گھڑی تک نہیں پہنتا۔ماں کے مانگے ہوئے وہ ''پانچ'' منٹ میری ساری زندگی پر پھیل گئے ہیں۔

اس ادارے میں جو میں بتانے جا رہا ہوں، میں ضرور ہر ماں کے پاس بیٹھ کر اس کی بات سنا کروں گا۔۔۔ان پانچ منٹ کا ازالہ شاید کر پاؤں۔۔۔مگر سوچتا ہوں کہ ماں کی ان آنکھوں کو جو میرے اندر کھل گئیں ہیں کیسے بند کروں گا!

....

رُخ دریا بھی موڑ سکتا ہے
پنچھی پنجرا بھی توڑ سکتا ہے
اے مسیحا ترا یہ دستِ کمال
دل کے ٹکڑے تو جوڑ سکتا ہے
تیرا دیوانہ سنگ در سے ترے
اپنا سر بھی تو پھوڑ سکتا ہے
ہے یہ سیلِ محبت اے جاناں
رُخ تری سمت موڑ سکتا ہے
تو ہی دھڑکن ہے دل کی اے ہمدم
دل تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہے

ناصر معروف/مسقط

....

کویت میں مقیم جدید لب و لہجے کے شاعر
طارق محمود طارق
کا اوّلین شعری مجموعہ
''فقط مجھ پہ عیاں ہوتا ہے''
چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔
پبلشر: مکتبہ فجر فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ،
اُردو بازار، لاہور۔ 0301-4492133

تازہ غزل

گلی کوچے گھروں سے اجنبی ہیں
منڈیریں آنکھوں سے اجنبی ہیں
معانی ہیں عبارت کی طلب میں
کتابیں حاشیوں سے اجنبی ہیں
کنوئیں نا آشنا بھولیوں سے
ترنجن لڑکیوں سے اجنبی ہیں
نمازی اور مساجد لا تعلق
مدارس طالبوں سے اجنبی ہیں
گریزاں ہیں بزرگوں سے محلے
فضائیں شفقتوں سے اجنبی ہیں
دھماکا ہو تو کھل جاتے ہیں از خود
کواڑ اب دستکوں سے اجنبی ہیں
دل اب بھی مبتلا ہونے کی دھن میں
قویٰ گو خواہشوں سے اجنبی ہیں
تغزل کو ترستا ہے زمانہ
ردیفیں قافیوں سے اجنبی ہیں

محمود شام/کراچی

....

زندگی جب بھی روبرو آئی
میں ہر اک دُکھ کو خود ہی چھو آئی
جب بھی اُس کا خیال آیا ہے
اپنے دل سے بھی مشک بو آئی
ہے عجب رُت یہ میرے گلشن میں
لے کے دامن میں جو لہو آئی
خار کچھ اور خنجر دیکھے
کر کے دامن کو جب رفو آئی
میں نے دیکھی نہیں تھی جو صورت
کیوں مرے دل میں ہوبہو آئی
میں نے شاہین اُسے پکارا جب
اپنی آواز کو بکو آئی

نجمہ شاہین/ڈیرہ غازی خاں

....

بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔۔!

فوزیہ بھٹی/ لاہور

بات تو کچھ بھی نہیں تھی اس کو شاید ایسے ہی چلے جانا تھا ہاں۔۔شاید۔۔! ایسے ہی چلے جانا تھا۔ مگر کیا پتہ وہ سچ ہی کہتی تھی۔ہاں۔۔شاید۔۔! وہ سچ ہی کہتی تھی لیکن۔۔۔ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔؟ ہاں۔ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ مگر ایسا ہو بھی تو سکتا ہے ہوسکتا ہے مگر شاید۔۔یہ قدرتی عمل ہو۔۔یقیناً یہ قدرتی عمل ہی ہو سکتا ہے۔مگر شاید۔۔! یہ قدرتی عمل نہ بھی ہو۔شاید اسے الہام ہو جاتا تھا۔! مگر الہام کیسے ہوسکتا ہے اس بارے۔۔؟ یا پھر، وہ کوئی قبولیت کا لمحہ تھا۔! بھئی ہم بہت سی باتیں کہہ جاتے ہیں نا، اور وہ پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ہوسکتا ہے، قدرت نے یا قسمت نے، یا پتہ نہیں کیسے اس کے منہ سے یہ ایک جملہ ادا ہوا اور وہ پورا ہو گیا۔سچ کہتی تھی کہ اس کی محبت آسیب کی طرح مجھے چمٹ جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔میں تو خود آسیب ہو گیا ہوں۔بھلا کتنے برس ہوئے ہوں گے کہ میں نیند کی دوائی کے بغیر سو نہیں سکتا۔

میں انگلیوں پہ گزرے برس کھوجنے لگا۔ 7 برس۔؟ نہیں نہیں۔شاید 9۔! دو برس تو میں سو ہی نہ پایا تھا ڈھنگ سے۔۔۔میں نے اپنی میز پر پڑی نیند کی گولیوں والی شیشی اٹھائی۔

''اب آپ کی دوا بدل رہا ہوں۔اس سے بہت گہری نیند آئے گی۔ایک خاص عرصے تک اگر نیند کی دوائیاں استعمال کریں تو یادداشت کھونے لگتی ہے آہستہ آہستہ۔۔اور دوائیاں بھی اثر چھوڑ جاتی ہیں۔کسی بھی صورت ایک سے زیادہ مت کھایئے گا''۔ڈاکٹر نے نسخے پر اپنی اسٹیمپ لگاتے ہوئے اگلے مریض کے لئے گھنٹی بجادی تھی۔

کمال ہے، ڈاکٹر کہتا ہے کہ یادداشت ختم ہو جاتی ہے مگر مجھے تو وہ سب بھی یاد آنے لگا ہے جو کبھی اس کی زندگی میں سوچا ہی نہیں تھا۔تعجب ہے۔! ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ دوپہر کا کھایا کھانا بھول جاتا ہوں اگر یہ سوچوں کہ اس وقت قمیض کونسی پہنی ہے تو بھی یاد کہاں مجھے آتا ہے دیکھے بغیر۔۔۔مگر پچھلی باتیں جن پر دھیان نہیں دیتا وہ کیسے یاد رہ گئیں ہیں تعجب ہے نادانستہ طور پر اس نے اپنی قمیض کو دیکھا۔ہاں! ہاں نیلی ہی ہے، مگر نواز کو میں شاید وہ ہلکی گلابی قمیض کا کہا تھا۔۔! بھول گیا ہوگا۔

بے آواز چلتے ٹی وی کو دیکھ کر میں نے ریموٹ ڈھونڈنے کے لئے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔اب یہ کہاں رکھ دیا کم بخت نواز نے۔بس کل اس کو فارغ کردوں گا میں۔یہ رہا۔روز ناچے کے نیچے سے ریموٹ نکال کر وہ خود ہی ہنس پڑا۔!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا، روز ناچے میں آج کا دن قلم بند کرتے ہوئے اس نے پچھلی سطروں پر نگاہ دوڑائی۔

کہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی مگر پتہ نہیں اس کو شاید الہام ہو جاتے تھے۔بھلا سیدھی سادھی گھریلو عورتوں کو بھی الہام ہوتے ہیں۔! چمٹ گئی آسیب کی طرح اس کی محبت مجھے۔بہت دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے میں نے فریم میں لگی اپنی شادی کی تصویر کو چھوا......تھی خوبصورت۔!

عام سے نین نقش والی انور بیگم جب بیاہ کر یہاں آئی تھی تو آتے ہی دو کمروں والے مکان کو گھر میں بدل دیا تھا۔گھر کے ساتھ ساتھ اس نے رشید اکرم کی یعنی میری زندگی کی ترتیب بھی سنوار دی تھی۔ عام سا رشید اکرم سارے محلے میں ایک دم معزز ہو گیا تھا۔کلف لگے بے داغ کپڑے پہنے چمڑے کا بیگ نما پرس لئے جب میں موٹر سائیکل پر گھر سے نکلتا تو انور بیگم کا سلیقہ دُور سے ہی اپنا ڈھنڈورا پیٹنے لگتا۔سادہ اور خوش باش طبیعت والے رشید اکرم کے کھانے کا ڈبہ جب لنچ ٹائم پر کُھلتا تو ہر کوئی اپنا ڈبہ لیے میرے میز پر آن دھمکتا اور مل بانٹ کر کھانے کے کہتے کہتے اس کا سارا کھانا منٹوں میں ختم ہو جاتا۔

ازدواجی زندگی کے بیس سال بس یوں کٹ گئے کہ جیسے انہیں پر لگے ہوں عجیب عورت تھی انور بیگم بھی۔ماں بنی تب بھی سلیقہ طریقہ ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اسپتالوں کے چکروں کا سوچ سوچ کر ہَولنے والا میں عام سا بندہ ایک دن گھر آیا تو انور بیگم کے پہلو میں گوری سی منی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔!

وہ۔۔یہ۔۔۔کیسے؟ کے سوال اس کے منہ پر آتے آتے ہوا ہی ہو گئے۔یہ آج کل تو اسپتالوں کے بغیر بچہ نہیں ہوتا انور بیگم!!! میں خوش کم اور حیرت زدہ زیادہ تھا۔

ارے ہو جاتے ہیں۔ہمسائی یخنی گرم کرنے

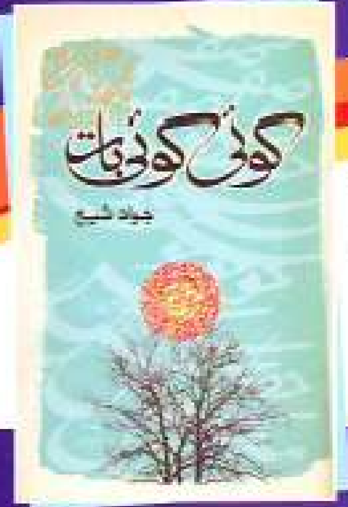

اپنے سامان کو باندھے ہوئے اس سوچ میں ہوں
جو کہیں کے نہیں رہتے وہ کہاں جاتے ہیں

ادبی تنظیم ''پہچان'' کے زیرِ اہتمام

ناروے میں مقیم منفرد لہجے کے خوب صورت شاعر: **جواد شیخ** کے پہلے شعری مجموعے

''کوئی کوئی بات'' کی تقریب پذیرائی

جواد شیخ کی خوب صورت شاعری نے حاضرین کے دِل موہ لیے

رپورٹ: آغا تنویر

صدارت ڈاکٹر خورشید رضوی نے کی، جبکہ مہمانِ خصوصی امجد اسلام امجد تھے۔

غلام حسین ساجد، عباس تابش اور حمیدہ شاہین کا اظہارِ خیال۔

لاہور ادب اور ادب کی ترویج کے حوالے سے اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب اس ادبی دارالخلافہ میں کوئی تقریب منعقد نہ ہوتی ہو بلکہ یہاں تو ایک روز میں بیک وقت کئی تقاریب انعقاد پذیر ہوتی ہیں، ان میں کچھ تقاریب اتنی خوب صورت اور شان دار ہوتی ہیں کہ یادگار بن جاتی ہیں اور اُن کی گونج کافی عرصہ تک سنائی دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک تقریب گذشتہ دنوں لاہور میں منعقد ہوئی۔ یہ ناروے میں مقیم معروف نوجوان شاعر جواد شیخ کے پہلے شعری مجموعے ''کوئی کوئی بات کی'' تقریب پذیرائی تھی جو کہ ایمبسڈر ہوٹل کے خوب صورت ہال میں منعقد ہوئی۔

تقریب کا اہتمام ممتاز شاعر اور سفرنامہ نگار اور ادبی تنظیم ''پہچان'' کے چیئرمین حسن عباسی نے کیا۔ تقریب کے آغاز سے قبل ہی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی معروف شخصیات کی آمد سے رونق دیدنی ہو گئی تھی۔

تقریب کا آغاز حسبِ روایت قرآن پاک کی تلاوت سے ہوا اور اُس کے آقائے دو جہاں حضرت محمدؐ کی نعت پیش کی گئی، یہ سعادت معروف نعت گو شاعر عبدالمجید چشتی کے حصہ میں آئی۔ نظامت کے فرائض نامور کمپیئر اور معروف صحافی نواز کھرل نے سر انجام دیے۔ تقریب کے آغاز میں انہوں نے چیئرمین ''پہچان''

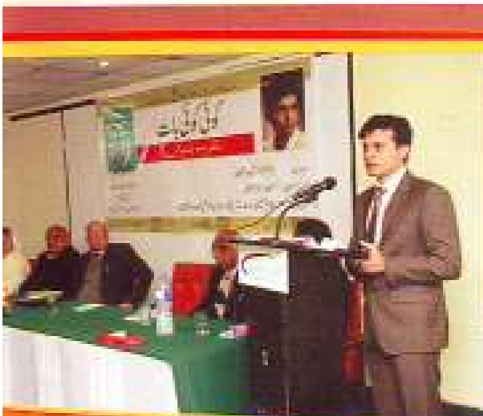

جواد شیخ کے کلام کی خوبی اُس کی تازہ کاری ہے، اُس نے ارتقائی مراحل بخوبی طے کیے ہیں۔ (ڈاکٹر خورشید رضوی)

جواد شیخ جدید غزل کا نمائندہ شاعر ہے۔ (امجد اسلام امجد)   جواد شیخ کی شاعری میں بے ساختہ پن اور وارفتگی ہے۔ (غلام حسین ساجد)

حسن عباسی کو اظہارِ خیال کے لیے مدعو کیا۔ حسن عباسی نے بطور میزبان تقریب میں تشریف لائے ہوئے تمام معزز شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا کہ اُن کے اشاعتی ادارے نستعلیق مطبوعات کا مقصد صرف کاروبار کرنا نہیں بلکہ خوب صورت اور دیدہ زیب کتب کی اشاعت اور علم و ادب کی ترویج ہے۔ جواد شیخ کا شعری مجموعہ اپنی شاعری اور پروڈکشن کے حوالے سے اُن کے ادارے کی چند معیاری کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی نظم ''دوستی'' بھی جواد شیخ کے نام منسوب کر کے سُنائی، جس پر حاضرین نے دل کھول کر داد دی، حسن عباسی نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ مستقبل میں بھی اپنی تنظیم ''پہچان'' کے زیرِ اہتمام علم و ادب کی ترویج کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ تقریب کی صدارت نامور شاعر ڈاکٹر خورشید رضوی نے کی جبکہ مہمان خصوصی مقبول شاعر، ڈرامہ نویس اور کالم نگار امجد اسلام امجد تھے۔ دیگر اظہارِ خیال کرنے والوں میں غلام حسین ساجد، عباس تابش اور حمیدہ شاہین تھیں۔ نواز کھرل نے سب سے پہلے حمیدہ شاہین کو جواد شیخ کے شعری مجموعے کے حوالے سے اظہارِ خیال کی دعوت دی، حمیدہ شاہین اپنی عمدہ شاعری اور اعلیٰ تخلیقی نثر کے باعث ادبی حلقوں میں اپنی خاص پہچان رکھتی ہیں اُن کے مضمون کو بہت سراہا اور پسند کیا گیا، بہت سے ایسے جملے تھے جن پر بھرپور کلیپنگ ہوئی، انہوں نے جواد شیخ کی شاعری کو دیارِ غیر میں ہونے والی شاعری میں نہایت منفرد اور بھرپور قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ ''عموماً نوجوان شعراء کے جو پہلے شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ''کوئی کوئی بات'' اُن میں نہایت منفرد ہے۔ اس کا کلام پڑھ کر حیرت کے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔'' غزل کے مقبول شاعر عباس تابش نے اپنے اظہارِ خیال میں جواد شیخ کی شاعری کو بے حد سراہا۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت پوری دُنیا میں جو نوجوان شاعری کر رہے ہیں یہ بات میں مکمل یقین اور اعتماد سے کہہ رہا ہوں کہ جواد شیخ کا نام تیسرے یا چوتھے نمبر پر لیا جا سکتا ہے۔ جواد شیخ کی شاعری میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، اُس کے اشعار میں مقبول ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ نواز کھرل اپنی نظامت کے دوران ہر

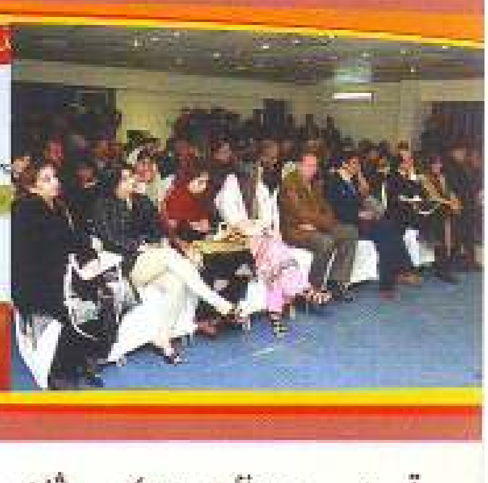

یہ تقریب لاہور میں منعقد ہونے والی چند یادگار تقاریب میں سے ایک تھی۔

جواد شیخ کی شاعری میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ (عباس تابش)

جواد شیخ کا کلام پڑھ کر حیرت کے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (حمیدہ شاہین)

مستقبل میں بھی "پہچان" کے پلیٹ فارم سے علم و ادب کی ترویج کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ (حسن عباسی)

مقرر کے اظہار خیال بعد جواد شیخ کے چند منتخب اشعار پڑھتے تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھتا، وہ تقریب میں تشریف لانے والے ادیبوں اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا نام لے کر وقتاً فوقتاً شکریہ ادا کرتے رہے جس سے حاضرین کو یہ بھی اندازہ ہوتا رہا کہ تقریب میں کتنے اہم افراد بطور سامع شریک ہیں۔ عباس تابش کے بعد جدید غزل کے ایک اور مقبول و منفرد شاعر غلام حسین ساجد نے اپنا مضمون پڑھا۔ اُن کا مضمون علمی و ادبی چاشنی کا مُرقع تھا، جسے حاضرین نے غور سے سُنا اور پسند کیا۔ غلام حسین ساجد نے جواد شیخ کی شاعری کے حوالے سے جن خوبیوں کی بات کی اور اُس حوالے سے جو اشعار منتخب کیے وہ لاجواب تھے۔ انہوں نے کہا "جواد شیخ کی شاعری میں بے ساختہ پن اور وارفتگی ہے، وہ جدید غزل کا معتبر شاعر ہے اور اُس کا مستقبل شاعری کے میدان میں روشن ہے۔

مہمان خصوصی امجد اسلام امجد نے اپنے اظہار خیال میں کہا کہ "جواد شیخ جدید غزل کا نمائندہ شاعر ہے۔ بیرون ملک جو شعراء رہتے ہیں، اُن میں جواد شیخ نے اپنے پہلے ہی شعری مجموعے سے منفرد جگہ بنالی ہے اور وہ اُن شعراء کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے، جن کی غزل کو اعتبار حاصل ہے۔" صاحب صدر کے اظہار خیال سے قبل جواد شیخ کو دعوت دی گئی، جنہوں نے اپنے دوستوں، اپنی فیملی، تمام حاضرین اور اظہار خیال کرنے والے مقررین اور بطور خاص حسن عباسی کا شکریہ ادا کیا، اُس کے بعد انہوں نے اپنی شاعری سُنائی اور کافی عرصہ بعد کسی کتاب کی تقریب میں مشاعرے کا سماں بندھ گیا، ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ شعری مجموعے میں جو چند اچھے اشعار ہوتے ہیں، اُن کو مضمون نگار اتنی بار پڑھتے ہیں کہ جب شاعر کے کلام سُنانے کی باری آتی ہے تو وہ اُنہیں پڑھتا ہے تو پھیکے پھیکے لگتے ہیں، مگر جواد شیخ کی شاعری کو بار بار سُنا گیا اور بھرپور پزیرائی ملی، اہل لاہور کا اعتراف ہی کسی شاعر کو معتبر بناتا ہے، لاہور ادبی فورم کے چیئرمین اور خوب صورت شاعر افتخار شوکت، بزم پُرنم کے چیئرمین محمد اقبال پیام شجاع آبادی اور بیکن بکس کے چیئرمین اور نامور ادیب زاہد محمود شمس نے جواد شیخ کو پھول پیش کیے۔ تقریب میں جہاں بہت سے دوستوں اور شاعروں نے جواد شیخ کو پھول پیش کیے، وہاں عزیز احمد نے پھولوں کا نذرانہ نظم کی صورت میں پیش کیا، جسے بہت سراہا گیا۔ آخر میں صاحب صدر ڈاکٹر خورشید رضوی نے اظہار خیال کیا، انہوں نے کہا "جواد شیخ کے کلام کی خوبی اُس کی تازہ کاری ہے، اُس نے ارتقائی مراحل بخوبی طے کیے ہیں۔ محسوس نہیں ہوتا کہ اُس نے شعر کہنے پر کوشش یا غیر معمولی محنت کی ہے۔ اُس کی شاعری کے پیچھے مکمل روایت ہے، میں جواد شیخ کے مستقبل سے نہایت پُر امید ہوں۔" تقریب میں جن نمایاں ادبی شخصیات نے شرکت کی، اُن میں سعد اللہ شاہ، حسین مجروح، اعتبار ساجد، فرحت پروین، امجد طفیل، علی رضا کاظمی، سلیم گورمانی، آفتاب جاوید، حمزہ رانا، تیمور حسن تیمور، تہذیب حافی، وقاص عزیز، اسما طاہر، عمران ناصر، شہباز انور، افتخار مجاز، محمد ابصار نے شرکت کی، تقریب میں بہت سے اخبارات اور چینلز نے کوریج کی۔ آخر میں ضیافت کا انتظام تھا۔ بلاشبہ یہ تقریب لاہور میں منعقد ہونے والی چند یادگار تقاریب میں سے ایک تھی۔

اپنی منت گزاریاں سائیاں
تیری سب ڈیرہ داریاں سائیں

دیکھ کے تیرے جلوے سائیں
میں واری میں صدقے سائیں

تیری جھلک کیا دیکھی سائیں
اپنی ہو گئی چھٹی سائیں

میں ہوں کچا کوٹھا سائیں
مار کسی دن پوچا سائیں

جس کی تجھ تک رسائیاں سائیں
ہیں اسی کی کمائیاں سائیں

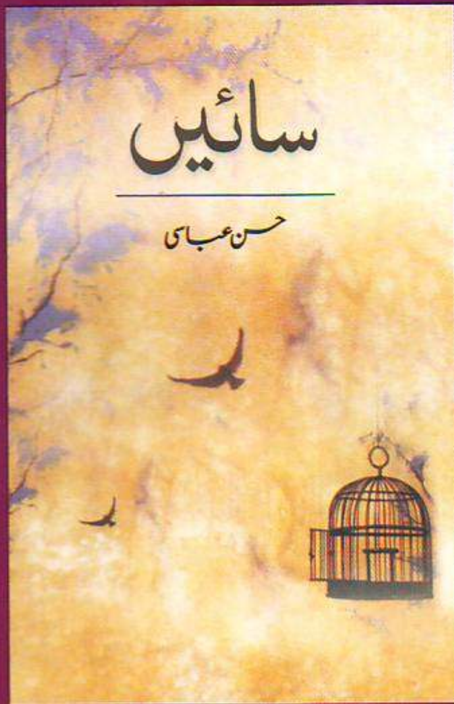

ممتاز شاعر اور سفر نامہ نگار

حسن عباسی

کا پہلا حمدیہ شعری مجموعہ

سائیں

شائع ہو گیا ہے

حسن نے میرے اور آپ کے رب کو جس نظریے سے دیکھا ہے اور اس حوالے سے جو شاعری کی ہے وہ حمدیہ روایت سے مکمل طور پر ہٹ کر ہے۔ حسن کا خدا بھی اس کے محبوب کی طرح میرے اور آپ کے محبوب سے جدا ہے۔ یہ حمد پڑھتے ہوئے بھی میں بیک وقت ایک روحانی اور رومانی تجربے سے گزرا۔ یہ ایک عجیب نظم ہے اور مجھے یقین ہے حسن کو یہ نظم دونوں جہانوں میں زندہ رکھے گی۔

عطاء الحق قاسمی

حسن عباسی نے ''سائیں'' میں متضاد کیفیات کی نازک پچی کاری سے حمد کا ایک ایسا بے مثل موزیک ترتیب دیا ہے.......... کہیں عجز کی پاس داری کا رنگ ہے تو کہیں انا کی آب داری کی دمک۔ کہیں گُریز، احتیاط اور حزن کی گرانباری ہے تو کہیں تجاوز، اصرار اور بے ساختگی کی تیز گفتاری اور یہ سب کچھ یک جان ہو کر ایک ایسے لہجے کی نمود کی اساس بن گیا ہے، جس کی کوئی مثال شاید اُردو کی حمدیہ شاعری میں اس سے پہلے موجود نہیں۔

غلام حسین ساجد

حسن عباسی کا حمدیہ دیوان ''سائیں'' ایک خوشگوار حیرت سے دو چار کرتا ہے۔ یہاں نقاشِ ازل کے روبرو ہونے کی سچی سنسنی ملتی ہے اور خدا سے تخاطب بندگانہ اُس پہلودار پارۂ الماس کی طرح لو دیتا ہے جس میں مختلف اور متضاد رنگوں کی چھوٹ ایک دوسرے پر پڑتی ہے اور ایک ایسے آئنہ خانہ میں لے جاتی ہے جہاں شاعر کا وفورِ احساس قاری میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ ان نو بہ نو رنگوں میں کہیں بے مائیگی کا احساس ہے کہیں نارسائی کی کسک، کہیں عجزِ ادراک کی جھلک ہے اور کہیں شرفِ انسانی کا وہ طنطنہ جس میں چھوٹے منہ سے بڑی بات بھی نازیبا معلوم نہیں ہوتی۔ گستاخی و بے باکی میں محبت کی رمزیں جھلکنے لگتی ہیں اور حُسنِ ادا سے شکوہ، شُکر میں ڈھل جاتا ہے۔

خورشید رضوی

حسن عباسی کا تازہ مجموعہ کلام ایک نادر حمدیہ شعری اظہار ہے جس نے مجھے ایک حیرت انگیز سرخوشی سے معمور کر دیا.......... ایک والہانہ پن ہے جو حسن عباسی کے حمدیہ اشعار میں بے ساختگی کے ساتھ پھلتا پھولتا آگے کی جانب اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے.......... حسن عباسی حمد گزاری کے اس عمل میں خود بھی ایک نئی لذتِ اظہار سے آشنا ہوئے اور وہ اپنے قارئین کو بھی مزاج آشنا بنانا چاہتے ہیں۔ میں حسن عباسی کو اس کے اس بیش قیمت حمدیہ مجموعے پر مبارک باد دیتے ہوئے نیک تمناؤں اور دُعاؤں کے ساتھ رُخصت کرتا ہوں۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

حسن عباسی نے ایسی دُھلی دھلائی اُجلی لفظیات استعمال کیں کہ پڑھتے ہوئے کورے برتن کی سوندھی سوندھی خوشبو دماغ تک جاتی محسوس ہی نہیں ہوتی نظر بھی آتی ہے۔ اُڈاریاں، میگھ ملہار، ساجھے داریاں، ٹاکیاں، چھلے، جھوک، جھگی، کچا کوٹھا، پوچا، پہاڑا، بوکا، کوجی، چھائیاں اور ایسے بے حد نئے نویلے، کنگھی کیے، سوہنے، چمکدار لفظ کہ دل میں اُترتے جائیں اور اُردو کے فرغل پر کنوارے ان چھوئے پھول ٹانکتے جائیں۔ غالباً سہیل احمد خان نے پہلی بارش کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی شاعری زندگی کے متنوع تجربوں سے چھلک رہی ہے۔ یہ قول ''سائیں'' پر بھی صادق آتا ہے۔

محمد اظہار الحق

ناشر
نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310-0331-4489310
nastalique786@gmail.com

آئی تھی۔ بڑی ہمت والی عورت ہے بھیا تمہاری۔۔!
کل سے درد یں لگیں ہوئیں تھیں، تم کو بھی نہ بتایا۔ آج بھی گھر کے کام نپٹاتی رہی کہ اسپتال گئے تو کوئی گھر آ کر یہ نہ کہہ دے کہ کیسا گندا مَندا گھر چھوڑ گئی تھی۔ اتنے میں وقت ہی نہ رہا۔ یہ دو گلیاں چھوڑ کر تو نذیراں دائی رہتی ہے مجھے آواز دی تو میں نے جھٹ بلوا لیا۔۔!

ارے اب منہ ہی دیکھتے رہو گے کہ بچی بھی اٹھاو گے۔ ہمسائی میرے ہونق بنے منہ کو دیکھتے ہوئے منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنسنے لگی۔

ہاں۔۔ہاں۔! میں نے زرد ہوتی انور بیگم کو شک سے دیکھتے ہوئے ننھی سی صائمہ کو گود میں اٹھا لیا۔ سوائے ان اٹھ دس دنوں کے پھر میں یعنی رشید اکرم نے انور بیگم کو دن کے وقت چار پائی پر پڑے نہ پایا تھا۔

صائمہ کو سولہواں لگا تو انور بیگم نے میرے ہی بھانجے سے اس کو بیاہنے کی ٹھانی۔

ابھی تو چھوٹی ہے۔! رشید اکرم نے صائمہ کی کمر تک آتی لمبی چوٹی کو دیکھ کر کہا۔

رشید صاحب۔۔ سولہواں لگ گیا ہے کوئی دن تاریخ لے لیں اب عابدہ باجی سے۔! انور بیگم نے حتمی بات کی مگر یہ سب کیسے ہوگا۔؟ یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی بھلا انور بیگم۔ رشید اکرم ہاتھ میں رکھا نوالہ واپس رکھ چکا تھا۔ کتنی بار کہا ہے کہ روٹی بیچ میں مت چھوڑا کریں ناشکری ہوتی ہے انور بیگم نے بارہا کہی بات دوہرائی۔

اچھا اچھا۔ رشید اکرم نے جھٹ نوالہ اٹھالیا۔

جتنی ضروری تیاری تھی میں نے کر لی۔! تکیوں میں بھرنے ولی امریکن روئی کے بادل کمرے سے ملحقہ سٹور میں رکھتے ہوئے وہ عام سے لہجے میں کہنے لگی۔

یوں دو ماہ میں صائمہ اپنے گھر کی ہوئی۔ آج برسوں بعد رشید اکرم نے اسی تشکر بھری نگاہ سے انور بیگم کو دیکھا تھا۔ جس نگاہ سے صائمہ کی پیدائش پر اس نے دیکھا تھا۔

آج کوئی اپنے دل کی بات ہی کہہ دو مجھ سے۔ پتہ نہیں کیوں رشید اکرم نے انور بیگم کو مخاطب کر لیا تھا۔ آج ہی تو بیٹی وِدا ہوئی تھی۔ دونوں ہی اپنی آنکھوں کی نمی ایک دوسرے سے چھپا رہے تھے۔

تم کہہ دو۔! انور بیگم کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

میں بس یہ کہوں گا کہ تم نے میری زندگی کتنی آسان کر دی ہے۔ کس قدر اچھی عورت ہو تم کبھی بھی کسی بھی طرح تم مجھے تنگ نہیں کرتی آج میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ مانگو۔! میں ساری دنیا لا دینے پر تو قادر نہیں مگر جی چاہتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ مانگو۔۔!

ایک وعدہ مانگوں گی اور ایک التجا دوہراؤں گی۔!

انور بیگم ہولے ہولے بولی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

ہاں۔ کہو۔۔!

وعدہ یہ کہ تم مجھ سے پہلے نہیں مرو گے۔ کبھی نہیں۔! مجھے اکیلے پن سے بڑا خوف آئے گا۔۔!

رشید اکرم ہنس پڑا۔ جھلی ، بے وقوف! یہ تو ربّ کے کرنے ہیں وہ مانگ جو میرے اختیار میں ہو۔!

تو تم کس بات کے مجازی خدا ہو۔۔؟

انور بیگم رشید کو دیکھنے لگی۔

اچھا بابا۔۔! وعدہ نہیں مروں گا تم سے پہلے۔!

پکا وعدہ؟ انور بیگم کی آنکھوں میں بے پناہ چمک اُبھری تھی۔

اور وہ التجا۔۔؟ رشید اکرم نے انور بیگم سے استفسار کیا۔

یاد ہے نا۔۔! میں تم کو کہتی تھی کہ مجھ سے بھلے جتنے بھی ناراض ہو۔۔! ہمیشہ مجھے معاف کر کے سونا دل میں میل رکھ کر نہ سونا۔

ہاں۔۔ہاں۔۔ یاد ہے۔ تو کبھی ناراض ہونے کا موقع بھی تو دے۔! رشید اکرم سنتا چلا گیا تھا۔

دیکھو رشید اکرم۔۔! یہ بات یاد رکھنا۔ اگر کبھی موقع آیا اور تم دل میں میل رکھ کر سو گئے نا تو کیا پتہ اگلی صبح ہی نہ ہو میری۔۔! پھر اپنے دل کا میل صاف کرو گے؟ بتاؤ۔؟ تمہارے بھلے کو ہی کہہ رہی ہوں! لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے تم کو میری باتیں یاد نہیں رہتیں۔! آسیب بن جاؤں گی مر کر تمہارے لئے۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں کہنے لگی۔

اچھا بابا۔! رشید اکرم دل ہی دل میں انور بیگم کے بھولپن پر دیر تک مسکراتا رہا۔

کیوں آ گئی تھی وہ لڑ کر گھر۔۔؟ رشید اکرم انور بیگم سے پوچھنے لگا۔

مارا تھا اسے رزاق نے۔! انور بیگم نے دوسری روٹی سینک کر رشید اکرم کی چنگیر میں رکھی۔

مارا تھا۔۔؟ اور۔۔تم مجھے اب بتا رہی ہو۔؟ اتنے آرام۔۔؟ تسلی سے؟ رشید اکرم نے نوالہ سامنے پڑی پلیٹ میں پٹخا۔

روٹی مت چھوڑو۔ !اسی لئے کہا تھا کہ بعد میں بتاؤں گی۔ انور بیگم نے تسلی سے خشک آٹے کو دوسری چنگیر سے ڈھانپا۔

میں ابھی جاتا ہوں عابدہ باجی کی طرف۔ رشید اکرم غصے سے اُٹھا۔

غلطی تمہاری اپنی بیٹی کی تھی رشید۔!

انور بیگم چائے کا پانی چڑھانے لگی۔۔۔

کہتی ہے چولہا الگ کردو۔۔!

رشید اکرم کے بڑھتے قدم رک گئے تھے وہ خاموشی سے واپس مُوڑھے پر بیٹھ گیا۔

میں خود ہی چھوڑ آئی تھی جا کر۔نہیں تو بات بڑھ جاتی۔ عابدہ نے بھی سمجھایا اور میرے اُسے خود واپس لے جانے پر خوش ہوئی، چار بہوؤں کا بکھیڑا تھا۔مگر صائمہ کے لئے کردیا چولہا الگ، اس لئے بات ختم ہوگئی۔

روٹی نہیں کھانی۔ اٹھالو، بس چائے دے دو۔۔۔!رشید اکرم بجھ سا گیا تھا۔

انور بیگم نے بڑے غور سے پلیٹ میں پڑے نوالے کو دیکھا اور برتن اٹھالیے۔

کچھ دن کے لیے بُلا لو اسے یہاں۔۔دل بہل جائے گا۔۔!کافی دیر سے گم صم بیٹھے رشید اکرم کے منہ سے آواز آئی۔

دل گھر میں ہی لگا رہے تو بہتر ہے ابھی وہیں رہنے دو میاں بیوی کی صلح ہو جائے تو دو چار دن کو لے آؤں گی۔

موسم بدلنے والا تھا انور بیگم رشید اکرم کے سویٹروں کے ڈھیلے بٹن پکے کررہی تھی۔

رشید اکرم نے گلے سے بھری ایک نظر انور بیگم پر ڈالی تھی اور چپ چاپ لیٹ گیا تھا۔

انور بیگم نے اگلی صبح کا چہرہ نہ دیکھا تھا چپ چاپ وہ نیند میں ہی دنیا کا دروازہ پار کرگئی تھی۔

نہیں، نہیں۔۔ وہ کسی ولی یا عنایت کے عہدے پر فائز تھوڑی ہی تھی۔ بس ایسے ہی کہہ دیا ہو گا۔ ہاں اس دوائی میں کافی اثر ہے رشید اکرم کی آنکھیں بند ہورہی تھی۔ یعنی ہوجاتا ہے کہ کبھی منہ سے نکلی بات پوری ہوجاتی ہے۔ اسے الہام نہیں ہوتے تھے میں جانتا ہوں۔ رشید اکرم گہری نیند میں بھی یہی بڑبڑاتا رہا تھا۔ میں نے زندگی میں اسے سب کچھ دیا بس یہی ایک بات تھی نا۔ تو کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی ایسی التجا تھوڑی ہی تھی۔ بندہ بشر ہوں فرشتہ تو نہیں ،آجاتا ہے غصہ تو پھر کیا ہوا۔ بات تو کچھ بھی نہیں تھی اس کو شاید ایسے ہی چلے جانا تھا ہاں۔۔شاید۔۔!ایسے ہی چلے جانا تھا۔ مگر کیا پتہ وہ سچ ہی کہتی تھی۔ ہاں۔۔شاید۔۔اوہ سچ ہی کہتی تھی لیکن۔۔۔ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔؟ ہاں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ مگر ایسا ہو بھی تو سکتا ہے ہو سکتا ہے مگر شاید۔۔۔ یہ قدرتی عمل ہو۔۔ یقیناً یہ قدرتی عمل ہی ہوسکتا ہے۔ مگر شاید۔۔! یہ قدرتی عمل نہ بھی ہو۔ شاید اسے الہام ہو جاتا تھا۔! مگر الہام کیسے ہوسکتا ہے اس بارے۔۔؟ یا پھر، وہ کوئی قبولیت کا لمحہ تھا۔۔۔ ویسے بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔۔۔۔!

....

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہورہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمراء: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

آس توت کو چھین لیتی ہے — آسرے بھی نڈھال کرتے ہیں
آپ اپنا جواب ہیں ہم لوگ — لوگ پھر بھی سوال کرتے ہیں

سعودی عرب اور کینیڈا میں مقیم نامور شاعر "جمیل قمر" کا شعری مجموعہ

"سکوت بولتا ہے" شائع ہوگیا ہے۔

صفحات:208 قیمت 350

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

ڈیسنٹ

فوزیہ بھٹی/لاہور

میں ٹوٹ رہی ہوں اور وہ یہ سب جانتا ہے۔ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہتا ہے اور بس دیکھتا ہی رہتا ہے۔ ہم دونوں کا رشتہ نجانے کب سے مر کر کہیں کسی کونے میں دفن ہو چکا ہے۔ ہم دونوں بس صبح و شام اداکاری کر رہے ہیں ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں بہت ڈیسنٹ ہیں اونچی آواز میں بات کرنا، چیخنا، گالی گلوچ، منہ بنائے پھرنا یہ سب تو ہم دونوں کی ڈکشنری میں ہے ہی نہیں۔ ڈیسنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ہم بہت اچھے اداکار بھی ہیں اتنے اچھے کہ اگر ہم دونوں کی زندگی پر کوئی کہانی لکھی جاتی تو جیتنے والے کے لیے پہلا انعام ہم دونوں کو بانٹنا پڑتا اور اسی بانٹ نے ہم دونوں کو پھر ایک دوسرے کے سامنے لا کر کھڑا کر دینا تھا۔

اپنی جوانی کو زور سے تھام کر رکھنے کے لیے ہم دونوں بہت جدوجہد نہیں کرتے۔ لائف سٹائل کی بات ہے نا۔ ہم دونوں ان لوگوں میں سے نہیں جنہیں بہت سال گزر جانے کے بعد اچانک یہ یاد آتا ہے کہ ''اوہ'' زندگی بہت پیچھے رہ گئی۔'' گو کہ ہمیں ساتھ رہتے ہوئے 7 برس گزر چکے ہیں اور ان سات برسوں میں بہت کچھ بدلا ہے۔ نہیں بدلا تو ہم دونوں کا ظاہر نہیں بدلا، بلکہ کچھ اور اچھا ہو گیا ہے۔ اس کے کچھ کچھ بال سفید ہونے لگے ہیں مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے اس کے بالوں نے ہی مجھے اس کی طرف متوجہ کیا تھا اور میں ہمیشہ اس سے کہا بھی کرتی تھی کہ تمہیں کچھ بھی ہو جائے تمہارے بالوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ جس پر وہ اتنی دلکشی سے مسکراتا تھا کہ میں سوچتی اگر میں کوئی مڈل کلاس جاہل گنوار عورت ہوتی تو فوراً اس کا صدقہ خیرات کر دیا کرتی۔ ان تمام 7 سالوں میں ہم ایک دوسرے سے اتنے واقف ہو چکے تھے کہ اگر میں کسی دن رات کو سونے سے پہلے اپنے بال برش کرنا بھول جاتی تو وہ خاموشی سے اپنا بازو میرے تکیے پر پھیلا دیتا جو اس بات کا اشارہ ہوتا کہ مجھے جو بھی پریشانی ہے میں کھل کر کہہ سکتی ہوں اور میں کہہ بھی لیا کرتی تھی۔

اصل میں ہماری زندگی اتنی پرفیکٹ اور Flow Less تھی کہ اس میں بہتری کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ٹھہری ٹھہری فلمی سیٹ کی طرح خوبصورت صاف شفاف زندگی۔ میں جانتی تھی کہ وہ بہت سی عورتوں سے دوستی رکھتا تھا جو کہ میرے لیے معیوب بات نہیں تھی وہ میرا تھا۔ میں اور وہ ایک چھت کے نیچے رہتے تھے۔ اس نے کبھی اپنی زبان سے مجھے خوبصورت یا محبت جیسے الفاظ کبھی نہیں کہے تھے مگر ہاں میرے ساتھ ہونا اس بات کی گواہی تھی کہ میں اس کے لیے وہ سب ہوں جو کوئی اور نہیں تھا۔

اب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو ہنس پڑتی ہوں کہ اسے مجھ پر کبھی غصہ نہیں آیا اور مجھے اگر غصہ آیا بھی تو میں نے کبھی اسے پتہ چلنے نہیں دیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ ہم دونوں بہت اچھے اداکار ہیں۔ کسی بات کا ذرا مان جاتے تو بس خاموش ہو جاتے اور اگلی صبح پھر سے ایک دوسرے کے سامنے مسکراہٹ لیے کھڑے ہو جاتے۔ ہماری ہچکچاہٹ ہم دونوں سمجھ سکتے تھے مگر بیان کرنے کے لیے دونوں راضی نہ ہوتے۔ زندگی کی ایسے بہت سے لمحے ہم دونوں نے محسوس کیے ہیں کہ میرا یقین ہے کسی اور نے محبت میں نہ محسوس کیے ہوں گے۔

مگر یہ کہانی بدل گئی وہ ویسا ہی رہا جیسا تھا مگر میرے اندر کی بیوقوف عورت نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔ وہ عورت جو میرے اندر رہتی تھی مجھ سے ضد کرنے لگی کہ میں اس سے لڑوں، بے تحاشا اور بے حد اور پھر وہ بھی مجھ سے جھگڑے ہم ایک دوسرے سے ناراض ہوں۔ جھگڑا اتنی شدت کا ہو کہ ہم بے حد خفا ہو جائیں۔ اتنے خفا ہو جائیں کہ میں اس کی اور وہ میری شکل نہ دیکھے۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو مس کریں اتنی شدت سے مس کریں کہ خاموشی سے چلتے چلتے ایک دوسرے کے برابر آن کھڑے ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم اس خاص مقام سے نکل کر اس عام مقام پر چلے جائیں جیسے لوگ ہوتے ہیں جیسے عام لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی محبت پر کبھی بے یقینی نہیں ہوئی مگر پھر بھی میرا جی چاہتا ہے کہ اب وہ کچھ کہے، بہت کچھ کہے اتنا کچھ کہے کہ سنتے سنتے تھک جاؤں اور اس سے کہوں کہ بس کرو؟ میں تمہاری آواز سنتے سنتے تھک گئی ہوں۔ لیکن پھر بھی وہ کہتا ہی جائے اور میں سنتی رہوں۔ میں اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے ہاتھوں اتنا تنگ ہو رہی ہوں کہ یہ مجھ سے جھیلا نہیں جا رہا۔ میں کوئی عام عورت ہوتی تو اس سے لڑ جھگڑ لیتی۔ سوال پوچھتی کہ مہینوں گزر گئے ہیں میں نے رات کو بالوں میں برش کرنا چھوڑ دیا ہے مگر اس کا بازو اب اس کے سینے سے ہی کیوں لپٹا رہتا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس کا فون اب مسلسل خاموش رہتا ہے کسی دوسری عورت کے پیغام اسے اب نہیں آتے۔ پتہ نہیں پھر بھی وہ کیوں کھویا کھویا رہتا ہے۔ کون سی جنگ ہے جو وہ اکیلے ہی اکیلے لڑتے چلا جا رہا ہے۔ میری انا مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں محبت کی بھیک مانگوں یا اس سے کہوں کہ پہلے جیسے ہو جاؤ۔ میرے سامنے یہ جو کافی کی پیالی رکھی ہے میں نے اس سے

بہت خاموشی اور اپنے مکمل ہوش وحواس میں رہتے ہوئے اس میں زہر ملایا ہے محبت دنیا کی وہ آخری چیز تھی جو میں کسی سے مانگوں، کیونکہ میں محبت پر یقین رکھتی ہی نہیں ہوں۔ محبت کچھ نہیں ہوتی۔ مجھے ہمیشہ ہی لگتا رہا کہ یہ ایک جذباتی غلطی ہوتی ہے۔ محبت کرنا میری Priority میں کبھی نہیں رہا، سو اب جب کہ میں خود پر آشکار ہو چکی ہوں۔ میں بہت ڈپریشن میں ہوں اور کسی بھی صورت اپنا امپریشن اس پر خراب نہیں کرنا چاہتی ۔ باہر شاید اس کی گاڑی رکنے کی آواز آئی ہے۔ ابھی کچھ دیر میں اس کی مخصوص خوشبو یہاں وہاں ساری جگہ پھیل جائے گی۔ اپنی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہوئے میں آہستگی سے کافی کے کپ اٹھاؤں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ جب میں ساری دنیا چھوڑ کر جاؤں تو میرے سامنے وہ ہی ہو جو میری ساری دُنیا ہے۔

ہاں! وہ ٹوٹ رہی ہے اور میں اسے ٹوٹتے دیکھ رہا ہوں۔ وہ بے حد خاموش رہنے لگی ہے گرچہ باتیں تو وہ پہلے بھی اتنی نہیں کیا کرتی تھی۔ مگر اب بہت ہی خاموش رہنے لگی ہے۔ ہم سات برس سے ایک ساتھ رہتے ہیں کوئی ایسی بات نہیں جو ہم ایک دوسرے سے بغیر کہے سمجھ نہ سکیں۔ وہ مجھے اور میں اسے اسقدر جانتے ہیں کہ شاید خود کو اتنا نہیں جانتے۔ ہم دونوں ہی مذہب کو کچھ خاص نہیں مانتے اور نہ یہ ہماری زندگی میں اس کی کوئی خاص جگہ رہی ہے۔ اس کو میں اور مجھ کو وہ جب پسند آئے تو بھی میرے ایک ٹیکسٹ میسج پر وہ اگلے دن اپنے بیگ کے ہمراہ دروازے پر موجود تھی۔ میری زندگی کی وہ واحد عورت ہے جو میرے لیے کپڑے منتخب کرتی ہے۔ وہ واحد عورت ہے، جس سے مجھے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا کہ وہ میری زندگی یا مجھے بدلنے کی کوشش کر رہی ہے عام عورتوں کی طرح وہ کھانے پر میرا انتظار نہیں کرتی یہ اور بات ہے کہ میں جس دن بھی باہر سے کھانا کھا لوں وہ اکثر کھانا چھوڑ دیتی ہے اور مجھ سے ہی کہتی ہے کہ آج اسے بھوک نہیں ہے یا اُس کی جینز کا بٹن کل تنگی سے بند ہوا تھا۔ وہ کبھی مجھ سے تقاضا نہیں کرتی وہ کچھ اس طرح سے میری زندگی میں پھیل گئی ہے کہ اس کا رنگ آہستہ آہستہ ہر طرف کھلنے لگا ہے شروع شروع میں میں نے بہت سوچا کہ کس طرح سے یہ سب چلے گا میں خوفزدہ تھا کہ سوال نہ کرنے لگے ڈیمانڈ نہ رکھنے لگے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھے احساس ہوا کہ وہ بالکل ویسی ہے کہ اگر میں بھی عورت ہوتا تو اس جیسا ہوتا۔ وہ بالکل میری طرح 'جیو اور جینے دو' والے مقولے کی زندگی گزارتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ میرے خدشے دم توڑنے لگے۔ ہم خوش تھے یا نہیں تھے مگر ہم بہت پُرسکون اور بے حد مکمل تھے۔ مجھے جب بھی کسی بات پر تھوڑا بہت غصہ آتا یا میں الجھن کا شکار ہوتا کسی جادوئی طریقے سے وہ چیز ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے غائب ہو جاتی۔ میں پچھلے کچھ عرصے سے بہت پریشان ہوں۔ میں دیکھتا ہوں، سمجھتا ہوں کہ وہ الجھی ہوئی الجھی ہوئی ہے مگر کہے گی نہیں۔

پتہ نہیں کیوں میں اس کو آزمانے لگا ہوں میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بحث کرے، صرف 'جی' یا 'ہاں جی' کہہ کر مجھے خدا نہ بنائے رکھے وہ مجھ سے ضد کرے بے حد ضد کرے اور میں ایک تکرار کے بعد اس کی ضد مان لوں۔ ٹھیک 55 دن گزرے ہیں اس نے رات کو اپنے بالوں میں برش کرنا چھوڑ دیا ہے جو کہ اس بات کا غماض ہے کہ وہ پریشان ہے اُلجھ رہی ہے کیا میں اس کو توڑنا چاہتا ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں، بالکل نہیں۔ اصل میں ہم اتنا خاموش رہ چکے ہیں کہ ایک دوسرے کی آواز گونجتی سنائی دیتی ہے۔ ہم شاید بات اس لیے بھی نہیں کرتے کہ ہم ایک دوسرے سے بے حد مطمئن ہیں۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے نہ میں اس کو چھوڑ سکتا ہوں نہ ہی وہ مجھے چھوڑ سکتی ہے۔ کم سے کم اپنی زندگی میں تو نہیں۔

کل رات اس کے سائیڈ ٹیبل پر ایک بل رکھا تھا۔ پر میری عادت کے برخلاف ہے کہ میں اس کے فون یا کسی بھی پرسنل چیز کو ہاتھ لگاؤں یا جانچ پڑتال کروں اس کے باوجود میں نے وہ بل اٹھایا پڑھا اس بل کی لسٹ میں موجود تھا یہ ایک خاص قسم کا زہر ہے تو حتی الواسع بغیر تکلیف کے موت کا باعث بنتا ہے۔ اتنا تو میں اُسے جانتا ہوں کہ وہ یہ زہر میرے لیے نہیں لائی اور اس کے علاوہ تیسرا کوئی موجود نہیں جس کو وہ یہ زہر دے گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ وہ میرے سامنے ہی پیئے گی کیونکہ جتنی محبت وہ مجھ سے کرتی ہے وہ مرتے ہوئے ضرور یہ پسند کرے گی کہ میں اس کی نظروں کے سامنے رہوں بل واپس رکھتے ہی میں دبے قدموں سے سٹڈی کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ رات کے اس پہر وہ خاموشی سے زمین پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھی کیا مانگ رہی تھی میں جانتا ہوں۔

میری گاڑی ابھی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ اپنی مٹھی میں انگوٹھی دبائے میں چند لمحوں میں اس کے سامنے آج پہلی بار گھٹنے ٹیک دوں گا اور ہاں! کافی اسکی وہ محبت ہے جس کے ساتھ اس نے ہمیشہ مجھے شیئر کیا ہے۔ کافی کا وہ کپ جو کہ اب میری آنکھوں کے سامنے ہے اور جسے وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتی جا رہی ہے انگوٹھی پہنانے سے پہلے میں اس کو ضائع کر دوں گا۔ ہاں! میں اسے سمجھتا ہوں اور وہ مجھے۔

....

خورشید مستانہ / میاں چنوں

ساڈے ویہڑے چہ سُن سَراں کیتا تیرے جلیے جلوہ ساں ٹوں کیہ کرنا
دیوار ساڈے پیار دا ڈھے گیا اے تیرے بلدے فانوساں ٹوں کیہ کرنا
ساٹوں مار کے تار کے ہُن اندر کھڑ کے لاش ٹوں ویکھ کے رون لگیں
جدوں اسیں نہ رہے جہان اُتے پُچھوں تیرے جلوساں ٹوں کیہ کرنا

غرضاں دے لوکی تے ایمان ویچ لیندے اے
جند ویچ لیندے نالے جان ویچ لیندے اے
نک رہ جے موہنہ تے سواد آوندا اے دوستو
نک ٹوں بچا لیندے آن ویچ لیندے اے
اُچے اُچے ممبراں تے کھڑے ہون والے وی
اکھاں نال ویکھیا بیان ویچ لیندے اے
میت دا اوہ ناں لے کے چندہ پئے منگدے
نمازی ویکھے جتھے دا نشان ویچ لیندے اے
مستانیا جے بکری دی چوری پچھے لگ جے
ٹل دے نہیں رب دا قرآن ویچ لیندے اے

سدھراں اصل دے لیندیاں دُکھاں بھرے کلاوے اے
دل دیاں اتاں غم دا جھوکا بن بن پکدے آوے اے
دو موہنہاں ایہہ ویلا یارو دونویں پاسے ڈنگدا اے
ہُن سجناں ٹوں جن ویکھو پھلدے وانگ چھلاوے اے
اِک نکی جہی گل سی جیہڑی معنا بن گئی عمراں دا
اونچ تے ساریاں اُٹھاں اُتے لدے یار کجاوے اے
ونڈے دی ڈھونگیاں سوچاں موہنہ کملائے دانیاں دے
جنہاں دے مُنڈھ لہو دی برکھا اوہو پتھر ساوے اے
اَج عقل دیاں اَکھاں دے وچ گھٹا پایا ناداناں
مت والے مستانیاں دے ہُن غدر کوئی نہ دعوے اے

جواہ کھیڈ نا کم اے تکڑیاں دا ماڑا بندہ تے بار نہیں سہہ سکدا
ویلا ایہو جیہا دوستو آ گیا اے ہُن تے یار دی یار نہیں سہہ سکدا
غیرت مند تاں موت قبول کر لو بے شرمی دی مار نہیں سہہ سکدا
مستان جیہڑے بھتیر ٹوں گھن لگے اوہو کوٹھے دا بھار نہیں سہہ سکدا

رُوں گئی احساس ناں جس ویلے
دھاگے پیار دے بڑے باریک نکلے
جنہاں گنڈھ میری تے وار کیتا
مُڑ کے ویکھیا اوہو شریک نکلے

کیہڑی گل جو دَس نوں رہ گئی
ہُن طبیعت ہَس نوں رہ گئی
خوشحالی دی دوہتی یارو
میرے گھر تاں دَس نوں رہ گئی

جنہاں نے ملناں ہووے سجنوں ملدے چیر جھناواں
قسم خدا دی اوہ نہیں ویہندے اُچیاں نیویاں تھاواں
موت حیاتی جان کے یارو سر جاندائے پروانہ
بلدی لاٹ دے اُتے لکھدا اوہ اپنا ہر ناواں
عشق دی کوئی وی حد نہیں ہُندی عشق تے لامحدود
کیہ تھلاں دے پینڈے یارو کیہ بیلے دیاں راہواں
دل وچ جھاتی مار کے ویکھو یار وکھالی دیندا
ایویں کملے لوکی آہندے بول بنیرے کاواں
غیراں نے وی مارے پتھر اپنیاں وی پھل مارے
دوہواں رسم ادا اے کیتی کہنوں گل ناں لاواں
چُوریاں کھاون والے لُکھاں تھاں تھاں پھردے ویکھے
مستانیا لبھو کوئی دیون والا ملدا ٹانواں ٹانواں

اکھیاں دے کمرے چہ لالاں تصویر تیری
پلکاں دا بُوہا فیر کر لواں بند وے
کوئی وی ناں ویکھے دندھاں لال سُوہیاں بُلیاں نوں
کوئی وی ناں تکے تیرے چٹے چٹے دند وے

....

پہرا دیواں ساری میں حیاتی چن کھتاں
رَبّ دی سوں کھڑی ہو کے ساہواں دی دہلیز تے
ایہو میری خاہش چناں ایہو میری آس چناں
ایہو میرے ٹٹ پینے دل دی پسند وے

....

منگاں پئی دعاواں جت اُٹھ کے میں تڑکے
میرا رہویں میرا رہویں شالا جیون جوگیا
لگا رہندا ایہو میٹوں کھو کاتے دُھڑکا
ہور کوئی نہ مار لے ناں کنڈ وے

....

ڈوہنگے پینڈے پیار دیاں یاداں دے نمانیاں
اللہ کرے ہور لے لے ہندے جان وے
بن جاواں دُھوڑ ماہی تیریاں میں قدماں دی
کدی وی ناں مکے میری زندگی دا پندھ وے

....

تیرے پچھے جندڑی گنوا لئی مستانیاں
اجے وی ناں میرا بنیں میں کیہ تینوں آکھناں
ہتھ جوڑ میں تاں دے غلام تیری ہو گئی
رہناں ساری عمر ایسے گل تے پابند وے

غماں دی بُجھ

ہویاں خوڑے کی گلاں پئی قدیاں چھڑ ٹلاں
دے میں ایہو جہی گنڈھ، جیہڑی کے توں ناں کھلاں
میرے ہس دے نصیباں اُتے قہر پے گیا
ہائے منگے سی تے ہنجواں دا خیر پے گیا

....

پچھے والاں وچ وال، ڈاہڈا ہو گیا کمال
سوہنے پیار دے سنیہڑے رُس گئے ساڈے نال
اَج سدھراں دے چولے دا گلاواں پاٹیا
تکی پیار دی کہانی ہر ناواں پاٹیا

....

وٹی غماں دی جیوں بُجھ، گئی دُکھاں وچ رُجھ
ٹٹی آساں تے امیداں والے چرخے دی گُجھ
ٹٹی چاواں والی پونی دی اوہ آساں والی تند
رب جانے کیوں ناں کیتا میٹوں ماہی نے پسند

....

میرا چھچی والا چھلا، اوہ وی رووے پیا کلا
میٹوں اوہو پیا آکھیرا پھڑ کے اوہ پلا
ہتھاں نال دے کے ہُن دنداں نال کھولدی
دس نیارے نی توں موہنوں کیوں نہیں بول دی

....

حسین مجروح / لاہور

جو منہ کو آ رہی تھی وہ لپٹی ہے پاؤں سے
بارش کے بعد خاک کی سیرت بدل گئی

حسین مجروح کی غزل اور نظم سنجیدہ ہے، مگر تمام تر سنجیدگی کے باوجود یہ ایسی شاعری ہے جسے سردیوں کی راتوں میں کمبل اوڑھ کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ نظم پیچ در پیچ ہے۔ مصرعہ مصرعہ کھولتے جائیں تو حُسن بکھرتا جائے، جوڑتے جائیں تو سمٹتا جائے۔ نظم حسین مجروح کے شعری آنگن میں پرندے کی طرح اُترتی ہے، جس کے پروں میں کوئی تاریخ کے رنگ کا پر ہے تو کوئی فلسفے کے رنگ کا، کوئی تصوف کے رنگ کا ہے تو کوئی محبت کے رنگ کا، کوئی انقلاب کا ہے تو کوئی نفسیات کا۔ سو نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے ان رنگین پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی خوشگوار تاثر میں اضافہ کرتی ہے۔ ''آواز'' کو میں نے ایک سے زائد بار پڑھا ہے، اور ہر بار نئی لذت کشید کی ہے، یہ شاعری نئے انداز سے مجھ پر ظاہر ہوئی ہے۔ اس کے انوکھے پن اور انفرادیت نے ہر بار مجھے متاثر کیا ہے۔ (حسن عباسی)

سورج کی ایک پل میں طریقت بدل گئی
نکلا وہ شوخ گھر سے تو حدت بدل گئی

بیچے تمام عمر جو خواہش کے نرخ پر
لینے گئے وہ خواب تو قیمت بدل گئی

جو منہ کو آ رہی تھی وہ لپٹی ہے پاؤں سے
بارش کے بعد خاک کی سیرت بدل گئی

اعلان صبحِ نو ہے مگر روشنی نہیں
شاید امیرِ شہر کی نیت بدل گئی

مجروح عاشقی بھی ہے تاریخ کی طرح
راوی بدل گیا تو روایت بدل گئی

ہوائے شوق سرِ شام جب بھی چلتی ہے
تو دل کے طاق میں اک لالٹین جلتی ہے

عجب ہے شہرِ ملاقات کا چلن کہ یہاں
ہوا چراغ سے، خوشبو بدن سے جلتی ہے

نکل کے دل سے لہو پر یہ انکشاف ہوا
کہ گھر بدلنے سے آب و ہوا بدلتی ہے

غزال خواب نما ہے ترے خیال کی لو
جو دشتِ یاد میں بھولے سے آ نکلتی ہے

ہمارے خواب ہیں شاید کسی یتیم کا مال
کہ چشمِ تر بھی انہیں دیکھ کر گدلتی ہے

پڑے ہیں حسن کی ندی کو سونپ کر آنکھیں
مگر یہ نار کہیں اور جا نکلتی ہے

دل جو گردابِ خد و خال میں جا پہنچا ہے
اک بگولا ہے کہ بھونچال میں جا پہنچا ہے

زر کے بحران میں لوہے کی سلاخیں لے کر
بے ہنر شخص بھی ٹکسال میں جا پہنچا ہے

جس کو موسم نے یہ چاہا تھا کہ بے فیض رہے
اپنی قسمت سے وہ پھل، بال میں جا پہنچا ہے

اے گرفتارِ ہوس! تجھ کو خبر ہے کہ شعور
مال کے ساتھ تری آل میں جا پہنچا ہے

طمعِ دانہ بھی عجب ہے کہ فلک گشت پرند
جانتے بوجھتے پاتال میں جا پہنچا ہے

ہجر کا پل، جو ارادوں کی طرح ٹوٹتا تھا
جاں سے گزرا ہے تو اعمال میں جا پہنچا ہے

گلی میں اور بھی تھے لوگ اشتعال پسند
ہمی کو آئے مگر تیرے خد و خال پسند

عجب طرح کا ہے بیوپار یہ محبت بھی
اُسے نہ سودا ملے جس کو آئے مال پسند

ضرور اب کے شرارت ہوئی ہے پانی سے
کہ مچھلیوں کو بھی آنے لگے ہیں جال پسند

اب اور کیا ہو لہو کی کسادِ بازاری
کہ ہجر میں بھی محبت ہے اعتدال پسند

کبھی گراں ہے اسے گرمئ نفس تو کبھی
یہ عشق کرتا ہے شیشے میں کوئی بال پسند

زبردستی تھمایا ہوا قرض

ابھی آواز باقی ہے
ابھی کچھ سانس ہیں جن پر
دُکھوں کے قرض واجب ہیں
دکھوں کے قرض
جن کا اصل زر، تقدیر کے ماتھے پہ کندہ ہے
نجانے کتنی پشتوں سے
کسے معلوم، کیسے اور کہاں
یہ گردشی قرضے
چڑھے جیون کی پوتھی پر
وثیقہ کس نے لکھا، دستخط کس نے کیے
کس کی گواہی میں
مگر ہم سُود دیتے جا رہے ہیں
ان گنت قرنوں سے
ناخن اور نوحے مجتمع کر کے
تو کیا یہ اصل زر بے باق ہو پائے گا ہم سے
آخری ہچکی کی مہلت تک!!

خالد عرفان / امریکہ

لکھ رہا ہوں اک غزل امرود کی تعریف میں
کیا کروں امرود کا تو قافیہ نمرود ہے

برائے فروخت

تعلیم میں، ادب میں، سیاست میں، کھیل میں
ہر چیز بک رہی ہے ضرورت کی "سیل" میں
ووٹر بکے ہوئے ہیں، منسٹر بکے ہوئے
ناقابلِ فروخت ہیں اکثر بکے ہوئے
چونکہ ہے اپنے ملک میں ہر نوجواں فری
وہ لیڈروں کی سیل پہ اک عمر واں فری
جو بھی کھڑے ہیں قصرِ حکومت کے گیٹ پر
بکتے ہیں سب ضمیر فروشی کے ریٹ پر
اب ریلوے کے دام نئے مرحلے میں ہیں
"پی آئی اے" کو بیچنے والے مزے میں ہیں
تعلیم کا نظام شرارت سے کم نہیں
علم و ہنر بھی مالِ تجارت سے کم نہیں
اب نقل ہورہی ہے کتابوں کو کھول کے
استاد بک رہی ہیں ترازو میں تول کے
لیچر بکے، وکیل بکے، پیشوا بکے
ٹکٹ نہیں بکے ہیں، یہاں پارسا بکے
اک مولوی تو آم کی پیٹی پہ بک گیا
وہ روبت ہلال کھیلی پہ بک گیا

استاذِ فن اصولِ تجارت پہ بک گیا
شاعر مشاعرے کی صدارت پہ بک گیا
غزلیں خریدتی تھی، روپوں کے حساب سے
اک شاعرہ تو ہونے لگی پھر کتاب سے
خاتون" ایم این اے" تھی وزارت پہ بک گئی
لوٹوں کے ساتھ آج صراحی بھی بک گئی
ڈاکو جو رہ چکا تھا، خزانے پہ بک گیا
ووٹر غریب رات کے کھانے پہ بک گیا
کالم نگار حرف مکرر بھی بک گیا
اسٹاف جب بکا تو ایڈیٹر بھی بک گیا
منشی فروغِ عدل کی حالت میں بک گیا
بھوکا تھا جو وکیل عدالت میں بک گیا
کچھ اور مل نہ پایا دکانِ حیات سے
عورت فروخت ہوتی ہے، مردوں کے ہاتھ سے
تہذیب کی دکان میں فی الفور کچھ نہیں
بے غیرتی خرید لو، گر اور کچھ نہیں

کچھ باغباں بہار چمن بیچنے لگے
جب کچھ نہیں ملا تو وطن بیچنے لگے
اپنا تو پورا ملک "برائے فروخت" ہے
غالب صریرِ خامہ نوائے فروخت ہے

تقریبِ رونمائی

کتاب چھپ گئی چھ رنگے ٹائٹل کے ساتھ
طباعت اور کتابت کا بھی جواب نہیں
یہ رنگ اور یہ نوٹے گرام کا پیچ
ادب کے باب میں ایسی کوئی کتاب نہیں
سجی تھی بزمِ پذیرائی ایک ہوٹل میں
جہاں گلاب سے چہرے تو تھے گلاب نہیں
کسی وزیر نے اس بزم کی صدارت کی
یہ بات مجھ کو بتانے سے اجتناب نہیں
خوشا کہ بزم میں حاضر تھے ریڈیو، ٹی وی
نظامِ گردشِ دوراں ترا جواب نہیں
مقررین میں شامل تھے سب ہی دانشور
وہ ہستیاں تھیں جنہیں دیکھنے کی تاب نہیں
یہ کہہ کے غالب و مومن کا دے دیا درجہ
ادب میں ایسا کوئی اور آفتاب نہیں

صدرِ مشاعرہ

اربابِ ذوق نے جو بنایا ہے مجھ کو صدر
ہونے لگی ہے اب تو ظریفوں کی اُن کو قدر
جب مل سکا نہ صدر انہیں مامون کی طرح
میں اُن کے ہاتھ آگیا "ممنون" کی طرح
اسٹیج پر میں بیٹھ کے کرسی میں دھنس گیا
"انصاریوں" کے ساتھ مہاجر بھی پھنس گیا
مائک پہ اتفاق سے ہٹ ہوگیا تھا صدر
تصویر کے فریم میں، فٹ ہوگیا تھا صدر
کچھ لوگ کہہ رہے تھے مجھے صدرِ ذی وقار
مجھ کو نہ تھا خود اپنی سماعت پہ اعتبار
میں سوچتا تھا بزم میں شرکت کے بغیر
"زندہ ہیں کتنے لوگ صدارت کے بغیر"
سکریٹری نے میری جو عظمت بتائی تھی
اُس جھوٹ پر تو مجھ کو بہت شرم آئی تھی

سکریٹری یہ بولا، سنبھل جائے گا یہ صدر
لوکل مشاعرے میں تو چل جائے گا یہ صدر
ہر وقت دستیاب ہے، یہ اتفاقی صدر
کچھ اس سے مختلف تو نہیں ہے وفاقی صدر
اس کی معاشرے میں نہ گھر میں ہی قدر ہے
جس زاویئے سے دیکھو، یہ پورا ہی صدر ہے
ایسا ہی چاہئے ہمیں صدرِ مشاعرہ
جس کے قریب آئے نہ کوئی سخن ورہ
ہر مہ جبیں کے ساتھ چپک جائے بزم میں
یہ وہ نہیں جو پی کے بہک جائے بزم میں
یہ صدر وہ نہیں جو ہمیں بے ادب کرے
جو واپسی پہ بس کا کرایہ طلب کرے
بے وزن شاعری پہ بناتا نہیں ہے منہ
کہتا ہے نثری نظم کو سن کر یہ صرف "ہوں"
جب تک اسے پکڑ کے ہٹایا نہ جائے گا
ہونٹوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
آتا ہے گھر پہ رکھ کے صدارت کے شوق کو
ایسا ہی صدر چاہئے اربابِ ذوق کو

سو روپے کا سیب، اک سو بیس کا امرود ہے
کیا کسی کو پھر ہمارا امتحاں مقصود ہے؟
ایک ماڈل کو ملا ہے چانس لیکچر کے لئے
جس جگہ پہلے سے وائس چانسلر موجود ہے
کانا پھوسی ہو رہی ہے اہلیہ اور ساس میں
جس جگہ ماچس کی تیلی ہے، وہیں بارود ہے
باپ کی آواز پر سارے ہی بہرے ہو گئے
گھر میں اک مسعود، اک محمود، اک مشہود ہے
ان کے بچے ہو رہے ہیں سلسلے در سلسلہ
ایک "نومولود" کے پیچھے بھی "نامولود" ہے
پیر نے تعویذ سے ہر مسئلہ حل کر دیا
جانتا ہے وہ کہ دنیا میں خدا موجود ہے
ہائے اسلامی حکومت کا یہ بنکاری نظام
سو روپے کے قرض پر پچیس روپے سود ہے
اسپتالوں سے دوائیں سب چرا کر لے گیا
جو امیرِ انتظامِ شعبۂ بہبود ہے
لکھ رہا ہوں اک غزل امرود کی تعریف میں
کیا کروں امرود کا تو قافیہ نمرود ہے

طارق محمود طارق/راولپنڈی

تو نے جنت کو بنایا تھا ہمارے واسطے — اپنی جنت میں مگر ہم کو کہاں رہنے دیا

طارق محمود اپنے اخلاق و کردار میں یکتا مل کر نکھا ہوا شاعر ہے جیسے فلک پر ستارے اپنی مدت پوری کر کے اپنے ہم جولیوں سے بچھڑ رہے ہوتے ہیں۔ وہاں ان کی جگہ نئے ستاروں کی آمد کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ادبی اُفق پر میں نئے ستاروں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ طارق محمود بھی ادبی آسمان پر جگمگانے والا وہ ستارا ہے جس کی شاعری کی چکا چوند کسی ستارے سے کم نہیں۔ ان کی شاعری میں تمام تر لوازمات ملتے ہیں جو ان کے مطالعے کی غمازی کرتے ہیں۔ طارق محمود طارق کسی بھی اچھے شاعر کی طرح لفظوں کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ تشبیہات، استعارے، تلمیحات، اشارے، کنایے شاعری کا حسن ہوتے ہیں اور یہ حسن طارق محمود کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ طارق محمود نے اپنے پہلے مجموعہ میں تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، نعت، سلام، غزل، نظم، قطعات و فردیات کے ذریعہ اپنے قارئین کو ایک بھرپور مجموعہ پڑھنے کے لیے دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ "فقط مجھ پہ عیاں ہوتا ہے" شائقین ادب میں ضرور سراہا جائے گا۔ (نازاو کاڑوی)

تجھ کو پانے کے لئے چہرے پہ چہرہ رکھا
تاج سر پر ہی رہا ہاتھ میں کاسہ رکھا
حوصلہ زیست کے اِس کھیل میں اعلیٰ رکھا
بالمقابل کسی مہرے کے بھی پیادہ رکھا
یہ بھی اکثر ہی ہوا ہے کہ مظالم کے خلاف
پڑ گیا رکھنا قدم تنہا، تو تنہا رکھا
ایسے چُپ چاپ سہا جبرِ مسلسل صاحب
ہم نے ظالم کا بھی ہر حال میں پردہ رکھا
وہ وفاؤں سے مکرتے ہوئے شرمندہ تھا
اُس نے چہرہ بھی مرے سامنے آدھا رکھا

اپنے رَبّ کی ہی رضا پہ امتحاں رہنے دیا
لے کے ہم نے اِس زمیں کو آسماں رہنے دیا
تُو نے جنت کو بنایا تھا ہمارے واسطے
اپنی جنت میں مگر ہم کو کہاں رہنے دیا
ہم رہے دو زانو سے ہی گو خطا کوئی نہ تھی
اُس کی مرضی کا محبت میں سماں رہنے دیا
اپنی آنکھوں سے محبت کا فسانہ کہہ دیا
انتہائے شوق کو بھی بے زباں رہنے دیا
خواب ہم نے رکھ لیے تعبیر اُس کے نام کی
جو جہاں پہ ٹھیک تھا اُس کو وہاں رہنے دیا

ذکر اُس کا ہو گیا تو آنکھ طارق رو پڑی
عشق تو ناکام تھا ہم نے نشاں رہنے دیا

کِتنا پیارا سماں کفن میں ہے
درد دِل کا کہاں کفن میں ہے
اپنے اعمال کے ہی سر پر ہے
جو بھی جیسا جہاں کفن میں ہے
مال ہرگز نہ ساتھ جائے گا
اتنی وسعت کہاں کفن میں ہے
زندگی امتحان تھی یارو
اب نتیجہ یہاں کفن میں ہے
زندگی دے کے اِس لئے خوش ہوں
زندگی تو نہاں کفن میں ہے
حُسن مطلوب ہو ہی جائے گا
راہِ عشق رواں کفن میں ہے
تم تو بنتے تھے پارسا طارق
مر کے کیسا دُھواں کفن میں ہے

یونہی گھر میں میرے قاتل نہیں آیا ہو گا
راستہ اُس کو کسی نے تو دکھایا ہو گا
کیسے اُس کا کوئی اپنا یا پرایا ہو گا
جس نے لہجے کو تکبر سے سجایا ہو گا
چھوڑ آئی ہے جو دُنیا تیری خاطر ساری
خواب تُو نے کوئی اُس کو تو دکھایا ہو گا
ایک نیکی تو مرے نام پہ ہو گی شائد
کسی گرتے ہوئے بندے کو اُٹھایا ہو گا
جھڑ مانیں گے اُسے دشت میں رہنے والے
جس نے اِک دیپ بھی راہوں میں جلایا ہو گا

تھے غمگین قیدی ہمارے پرندے
رہا کر دیئے ہم نے سارے پرندے
چلو آؤ اوپر بڑا ہی مزہ ہے
ہمیں کر رہے ہیں اشارے پرندے
سبھی خواہشوں کی طرح پھڑ پھڑائیں
ہمارے پرندے، تمہارے پرندے
زمیں چھوڑ کر کاش جائیں وہاں ہم
جہاں لگ رہے ہیں ستارے پرندے
تو رنگ اُن کا طارق بدلتے بھی دیکھا
قفس میں ہے اِک دن گزارے پرندے

سید سعید نقوی / امریکہ

گاہے گاہے ترے چہرے پہ نظر کرتے ہیں   چشمِ حیراں تجھے حسرت نہیں بننے دیتے

فرحت پروین کے بعد ڈاکٹر سعید نقوی ہمارے دوسرے ایسے افسانہ نگار ہیں، جنہوں نے بطور شاعر بھی ادبی دنیا میں اپنی آمد کا اعلان با قاعدہ شعری مجموعے کی شکل میں کیا ہے۔ شاعر اور افسانہ نگاری کا یہ سمبندھ کوئی ایسا نیا اور انوکھا بھی نہیں کہ احمد ندیم قاسمی اور گلزار سمیت کئی نامور لکھاری اس کی کامیاب مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سعید نقوی اکثر و بیشتر مختصر طوالت کی کہانیاں لکھتے ہیں ان کی یہ اختصار پسندی شاعری میں بھی چھوٹی بحروں کے وافر استعمال کی شکل میں سامنے آئی ہے، لیکن افسانے کی گنجلک شاعری میں آ کر سہل ممتنع میں ڈھل گئی ہے کہ وہ بہت رواں بحروں میں سامنے کی باتیں بڑے مزے سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ فنی اعتبار سے کہیں کہیں وہ اٹکتے اور بھٹکتے ضرور ہیں، مگر مجموعی طور پر تاثر عام طور پر خوشگوار اور ہموار ہی رہتا ہے۔ دعا ہے کہ رب کریم ان کی شاعری کو بھی ان کے افسانوں کی طرح سے بہرہ ور اور ہمکنار کرے۔ (امجد اسلام امجد)

در و دیوار کا دکھ بعد کا ہے
یہاں تو مسئلہ بنیاد کا ہے
بدن کے سب عذابوں سے علیحدہ
وہ اک صدمہ تمہاری یاد کا ہے
مسافت تو تمہارے ساتھ کی تھی
مگر رستہ تمہارے بعد کا ہے
جہاں بھی دائرہ کھینچا ہے ہم نے
وہاں امکان کچھ امداد کا ہے
وہ جس کا ساز تیرے ہاتھ میں تھا
وہی نغمہ مری فریاد کا ہے
نہ گھر کی چھت پہ کوئی آنچ آئے
یہ اک قرضہ مری بنیاد کا ہے
تری تنقید تو دل کی زباں تھی
جو شکوہ ہے وہ تیری داد کا ہے
میں اپنے ساتھ بھی چلتا کہاں تک
ہر اک رستہ تمہاری یاد کا ہے
بنا تحریر کے یہ کورا کاغذ
نیا لہجہ مری فریاد کا ہے
میں کیوں بیٹھا ہوں ان کے راستے میں
زمانہ اب مری اولاد کا ہے

رت جگوں کو بھی عادت نہیں بننے دیتے
کشتۂ شب ہجر کو لذت نہیں بننے دیتے
جانے کیا سوچ کے پتھر وہ لیے پھرتے ہیں
سطحِ آب پہ صورت نہیں بننے دیتے
ہم نے ہر زخم کو جرات سے سوا رکھا ہے
ڈھال کی تیغ سے نسبت نہیں بننے دیتے

گاہے گاہے ترے چہرے پہ نظر کرتے ہیں
چشمِ حیراں تجھے حسرت نہیں بننے دیتے
رخ چراغوں کا بدلتے ہیں ہوا کے ڈر سے
گردِ ایام کو زحمت نہیں بننے دیتے
مان لیتے ہیں ہر اک بات ضروری اپنی
معرکہ ذات کا، وحشت نہیں بننے دیتے
چاکِ دامن کو بہ ہر طور سیا کرتے ہیں
دل کے آزار کو تہمت نہیں بننے دیتے
روز کرتے ہیں طوافِ رخِ زیبا تو سعید
اس کو آنکھوں کی ضرورت نہیں بننے دیتے

باہر کا کچھ رنگ نیا ہے کھڑکی میں
دستک دیتی آئی ہوا ہے کھڑکی میں
جس کی خاطر یہ فصیلِ ذات اٹھی تھی
آج وہی پھر شخص کھڑا ہے کھڑکی میں
اندر کے سب چہرے دیکھے بھالے ہیں
باہر کا کچھ رنگ نیا ہے کھڑکی میں
چاند یہاں تک آ کر واپس لوٹ گیا
جانے کیا منظر دیکھا ہے کھڑکی میں
خود کو باہر دیکھ کے میں یہ حیراں ہوں
آج یہ کیوں پردہ سا پڑا ہے کھڑکی میں
جب بھی اس نے تنہا دیکھا ہے مجھ کو
دل نے جلایا ایک دیا ہے کھڑکی میں

مانندِ قطرہ ایک سمندر سمٹ گیا
جیسے لہو بھی قطرۂ آنسو میں گھٹ گیا
صحرا نوردی اپنا مقدر نہ تھی اگر
کیسے بگولہ آ کے یوں ہم سے لپٹ گیا
ہے ہے یہ احتیاط، یہ اندازِ آرزو
در تک تو آگیا تھا وہ آ کر پلٹ گیا
یوں بھیگتا رہا میں ترے موسموں کے ساتھ
اک پورا آدمی تھا جو قسطوں میں بٹ گیا
میں زادِ راہ تجھ کو ہی لایا تھا مانگ کر
تجھ سے جدا ہوا تو میں رستے سے کٹ گیا
ایسے گزر گئے ہیں جہاں سے سعید ہم
جیسے کوئی حباب تھا دریا میں پھٹ گیا

''شاعر علی شاعر'' کی زیر ادارت شائع ہونے والے ادبی جریدے

عالمی رنگ ادب

کا خصوصی شمارہ......**فلسفۂ خوشی نمبر**

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔

رابطہ: آفس نمبر 5، کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

انور ندیم / گوجرہ

آج پھر دیر سے کیوں آئے ہو اتنے بیٹا
گھر جو لوٹا تو مری ماں نے وضاحت چاہی

مَیں نے تو جس کے لیے گاؤں سے ہجرت کی ہے
پھر اُسی شخص نے کیوں مجھ سے بغاوت کی ہے
ہر غزل میں مری شامل ہے فعولن، فعلن
مَیں نے دن رات اِسی فن کی ریاضت کی ہے
روز دفتر میں بہت کام ہیں ہوتے جاناں
اپنی بیوی سے کئی بار وضاحت کی ہے
زر ہے، گھر ہے، نہ کوئی کار، مرے پاس تو جان
پھر بتا تُو نے یہ کیوں مجھ سے محبت کی ہے
وہ مجھے کیوں نہ مِلا، عشق مرا خوار ہُوا
بات ساری تو یہ انور مری قسمت کی ہے

اُس سے کہنا کہ وہ اب خط نہ سنبھالے میرے
میری تصویر بھی کر دے وہ حوالے میرے
خوف کوئی بھی نہیں مُجھ کو یہ تاریکی کا
میری بیٹی، مرے بیٹے ہیں اُجالے میرے
فن مرے نے مجھے تا حشر ہے زندہ رکھنا
دوست میرے ہیں یہ اخبار رسالے میرے
عِشق کرنا ہے تو کُھل کر نہیں کرتے کیوں تم؟
آج اُس سے ہوئے ہیں سخت مقالے میرے
خشک ٹکڑوں پہ پَلا ہُوں مَیں تو انور یارا
مَیں نے کب ہے کہا کہ تر ہیں نوالے میرے

جس دن سے ستم تیری اَداؤں سے بندھے ہیں
ہم بھی تو اُسی دن سے وفاؤں سے بندھے ہیں
بند آج بھی ہے فاختہ نفرت کے قفس میں
اُلفت کے کبوتر تو ہواؤں سے بندھے ہیں
بچ جاتا ہوں ہر بار مَیں دُشمن کی نظر سے
حملے یہ مری ماں کی دُعاؤں سے بندھے ہیں
آئی تھی صَدا کان میں اِک روز تمہاری
ہم لوگ تو اب تک بھی صداؤں سے بندھے ہیں
کل جن کے مُقدّر میں محبت ہی تھی انور
کیوں آج وہی لوگ جفاؤں سے بندھے ہیں

بچپن نہیں رہا تو وہ آنگن نہیں رہا
خوشبُو سے جو بھرا تھا وہ گلشن نہیں رہا
موسم خزاں کا میرا تو جیون ہی کھا گیا
اُس پر بھی پہلے جیسا وہ جوبن نہیں رہا
گھر میں سجائے کانچ کے برتن نئے نئے
گھر میں کوئی بھی مٹّی کا برتن نہیں رہا
احباب میرے سارے تو شہروں میں جا بسے
میرا تو کوئی گاؤں میں دُشمن نہیں رہا
انور کے پاس میری جو مالا نہیں رہی
میرے بھی پاس اُس کا وہ کنگن نہیں رہا

وہ لڑکی خوبصورت تھی
مری پہلی محبت تھی
مرے ماں باپ بوڑھے ہیں
اِنہیں میری ضرورت تھی
غُبارے چھن گئے مُجھ سے
مرے گھر میں جو غُربت تھی
مَیں اِک بے بس حُسینؓ تھا
یزیدوں کی حکومت تھی
مزاروں پہ مَیں جاتا تھا
بزرگوں سے عقیدت تھی
وطن میں بے وطن تھا مَیں
پرندوں جیسی ہجرت تھی

آج پھر دیر سے کیوں آئے ہو اتنی بٹیا؟
گھر جو لوٹا تو مری ماں نے وضاحت چاہی

....

بہت دیکھا کہیں کوئی نہیں ہے
ترے جیسا حسیں کوئی نہیں ہے

....

خُدا کا دیا پاس میرے ہے سب کچھ
فقط ایک تیری کمی رہ گئی ہے

....

اجازت نہ دے جیب جب میری بیٹی
تو مَیں تیری گُڑیا بتا لاؤں کیسے؟

....

پانی آنکھوں سے پھر برستا ہے
پنچھی یادوں کے جب چہکتے ہیں

جناب احمد ندیم قاسمی (مرحوم) اور جناب عطاء الحق قاسمی کے نام

مَیں نے دیکھا ہے کہ شاعر تو یہ اکثر جاناں
زخم سہتے ہیں اور رہتے ہیں یہ مِل کر جاناں
قاسمی کے سبھی پہلو ہی حسیں ہیں لوگو
قاسمی کے سبھی چرچے ہیں یہ گھر گھر جاناں
روز دل کی تو حکومت نہیں ہوتی دل پر
روز تبدیل یہ ہوتے ہیں گورنر جاناں
"ظلم بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے" دیکھا مَیں نے
جب بھی آتا ہے پرندوں کا وہ لشکر جاناں
قاسمی جن کی مَیں شفقت کا تو ممنوں ہُوں بہت
عُمر میری بھی انہیں لگ جائے انور جاناں

خاکہ

حسن اختر جلیل

فرخ راجا

حسن اختر جلیل۔ ایک ایسا نام جو لوح دل پر انمٹ سیاہی سے تا زندگی نقش رہے گا۔ میرے اور ان کے تعلق کے کئی حوالے ہیں۔ بھائی اور دوست کی حیثیت سے بھی اور ایک ایسی شخصیت کے روپ میں بھی جو میری شاعری، نظریہ حیات، اخلاقیات اور نفسیات کو مکمل گرفت میں لئے ہوئے تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ ان کا پہلا عکس کب میرے آئینہ دل پر ابھرا لیکن ایک منظر کبھی نہیں بھولتا۔

میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا جوھر آباد ہی میں بھائی نے نئی نئی نوکری شروع کی تھی۔ اتفاق سے ان کا دفتر ہمارے سکول سے کچھ ہی فاصلے پر تھا میں Recess میں ان سے ملنے چلا گیا وہ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ میری میٹھی لسی سے تواضع کی گئی اور تمام دفتر والوں نے طرح طرح کے سوالات پوچھے اور میرے جوابات سن کر خوب محظوظ ہوئے، جلیل بھائی کا وہ چہرہ ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی میرے ذہن میں تر و تازہ ہے۔

ہم تمام بہن بھائی ان سے بہت محبت کرتے تھے ماں باپ کی تمام تر توجہ تو تھی ہی ان کے لیے۔ مگر ایک دن میں نے انہیں (Fits) میں مبتلا دیکھا تو دل بجھ سا گیا کچھ عرصہ سے وہ اس موذی مرض میں مبتلا تھے گو یہ بات میرے علم میں نہ تھی ایک دن شام کے وقت میں ان کے ہمراہ غلہ منڈی کی جانب سے گھر آرہا تھا کہ ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی انہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ شاید گھر پہنچنے سے قبل ہی ان پر بیماری حملہ کرے ہم بھاگ کر گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اس بیماری کا خاتمہ ماں باپ کی دعاؤں بزرگوں کی نظر شفقت اور ڈاکٹروں کی توجہ سے جلد ہی ہو گیا اسی زمانے میں ان کی شادی ہوئی جس کے بعد دوبارہ اس بیماری نے کبھی حملہ نہیں کیا لیکن اس کا اثر ان کی شخصیت پر تمام زندگی رہا۔

سرگودھا ان کا پہلا مسکن تھا گورنمنٹ کالج سرگودھا سے انہوں نے ۱۹۵۵ء میں گریجوایشن مکمل کی پھر ۵۶-۱۹۵۵ء میں جوہر آباد منتقل ہو گئے سرگودھا میں ان دنوں والد محترم جوہر نظامی ادبی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے اس لئے اس دور کے ادیبوں اور شاعروں تک رسائی جلیل کے لیے مشکل نہ تھی پھر غلام جیلانی اصغر کالج میں ان کے استاد تھے انور سدید طفیل گوندی عصمت ملنگ جیسے دوستوں کے نام تو مجھے بھی اکثر ان کی باتوں کے حوالے یاد ہیں۔

جوہر آباد میں جب ''بزم جوہر'' کی بنیاد رکھی گئی تو وہاں پر باہر سے آنے والی بہت سی شخصیتوں کی آمد اور قیام کے باعث اسے بہت پذیرائی ملی یہ وہ دور تھا جب شہزاد احمد، شکیب جلالی، اظہر جاوید، اختر امام رضوی، احمد ہمیش، فرہاد زیدی، توصیف تبسم، عابد علی عابد، عبدالحمید عدم، منظر کاظمی، ڈاکٹر صفدر حسین، قیصر باھروی جیسی شخصیات سے حسن اختر جلیل کو قریب ہونے کا موقع ملا۔ ان میں شہزاد احمد اور شکیب سے ملاقاتیں دوستی میں بدل گئیں جس نے حسن اختر جلیل کو جدید شاعری میں ایک اہم مقام حاصل کرنے میں بڑی مدد دی۔ شکیب جلالی جوہر آباد میں ہمارے قریب ہی رہتے تھے دونوں گھروں کی خواتین بھی ایک دوسرے سے بہت مانوس تھیں قیام جوہر آباد کے دوران میں یہ گھرانہ خاندانی محبت و شرافت کی علامت سمجھا جاتا تھا بعض لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ بھکر کے قیام کے دوران میں بعض شعراء کی پیشہ ورانہ چپقلش شکیب کی خودکشی کا سبب تھی مگر حسن اختر جلیل اسے نہیں مانتے تھے ان کے نزدیک شکیب کی ذہنی پریشانی کا سبب ان کے والد کی کیفیت تھی جو ہندوستان کے کسی ذہنی امراض کے ہسپتال یا جیل میں تھے انہیں اپنے والد کے تنہا ہو جانے اور بے بسی سے زندگی گزارنے کا از حد رنج تھا یا ناممکن تھا کہ انہیں گھر والوں سے کوئی شکایت رہی ہو۔ شاعرانہ چپقلش کا سامنا تو انہیں ہمیشہ سے رہا یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔

ہمارا گھرانہ مالی اعتبار سے بہت کمزور تھا والد محترم کی ملازمت زندگی کے سفر کو جاری رکھنے کا اک بہانہ تھی مگر وہ بڑے مضبوط ارادوں اور پختہ یقین والے انسان تھے۔

ان کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع تھا اس لئے وہ مشکلات سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تھے پھر بھی آٹھ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے تعاون کی ضرورت تھی چنانچہ جلیل بھائی اور آفتاب نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے ملازمت اختیار کر لی۔ میں جلیل

نائب تحصیلدار منتخب ہوئے یہی وہ دور ہے جب انہوں نے فنون، میں باقاعدہ چھپنا شروع کیا احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ان کے روابط آخر دم تک قائم رہے اگرچہ منصورہ احمد کے فنون میں آ جانے کے بعد جلیل بھائی نے اپنا کلام نہیں بھجوایا انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ محض زر رفاقت بر وقت نہ بھیجنے کے باعث نئی انتظامیہ نے ان کے کلام کو شائع نہیں کیا اور دیرینہ تعلق کو فراموش کر دیا۔ تحصیلدار منتخب ہونے کے بعد وہ پنجاب کے مختلف شہروں میں انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ 1975ء میں وہ PCS کرنے کے بعد مجسٹریٹ کی حیثیت سے فیصل آباد میں تعینات ہوئے ان کے قیام ٹوبہ ٹیک سنگھ، جڑانوالہ، فیصل آباد اور بھکر میں مجھے ان کے ہمراہ رہنے کا موقع ملا۔ بعد میں وہ بطور A/C اور ACG راولپنڈی، میانوالی، اٹک، حافظ آباد، گوجرانوالہ میں بھی رہے۔ قدرت کی کرم نوازی کہ صفدر حسین، حسن عباس اور رضی عباس بھی سول سروس کے لئے منتخب ہو گئے جلیل نے بھائیوں کو اپنے تجربات اور مشاہدات منتقل کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا آخری دنوں میں وہ صفدر کے گھر ہی ٹھہرے ہوئے تھے اس نے بھی آخری وقت میں جلیل کی بھرپور خدمت کی۔

وہ جہاں بھی جاتے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ان کا منتظر ہوتا۔ دوستوں میں اپنی خوش مزاجی اور خوش کلامی سے توجہ کا مرکز بن جاتے برجستہ جملوں اور بے تکلفانہ گفتگو ان کی شخصیت کا بنیادی وصف تھا قیام سرگودھا کے دوران ایک مشاعرہ ہو رہا تھا ادیب برنی اپنی نظم سنا رہے تھے جس کا ٹیپ کا مصرع تھا۔

مجھ سے بڑھ کر یتیم کوئی نہیں

جلیل نے دو تین بار سنا تو حس مزاح نے جوش مارا بلند آواز سے کہنے لگے۔ کیوں تیرے دو پیو موئے ہوئے نیں (کیا تمہارے دو باپ مرے ہوئے ہیں۔)

ان کے بے ساختہ ریمارکس نے محفل کا رنگ بدل دیا۔ فیصل آباد میں ریاض مجید، انور محمود خالد، احسن زیدی، ارشد جاوید، زاہد فخری، سلیم بیتاب اور حاتم بھٹی سے تعلق خاطر رہا۔ جڑانوالہ میں ڈاکٹر رشید گوریجہ، علامہ انور معین نجمی اور رشید ملک سے دوستی تھی ظفر اقبال جب بھی اوکاڑے سے تشریف لاتے ان سے ملاقات ہوتی بھکر میں خلیل رامپوری اور اسد جعفری اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انور مشہدی ان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے گوجرانوالہ میں احسان رانا اور راز کاشمیری اور اختر حسین جعفری جھنگ میں شیر افضل جعفری، جعفر طاہر جبکہ راولپنڈی میں توصیف تبسم، صادق نسیم، اختر امام رضوی، آفتاب اقبال شمیم، ناصر زیدی جمیل ملک، سلطان رشک، ضمیر جعفری، جلیل عالی غضنفر مہدی، عطا حسین کلیم، احسان اکبر قمر رومینی، رشید نثار سے خصوصی تعلق قائم رہا۔

ان کی شخصیت کے مختلف اوصاف ایک فلم کی شکل میں میرے سامنے ہیں جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ شگفتہ مزاجی تو ان کی شخصیت کا حصہ رہی لیکن کبھی کبھی کسی ایک شخص پر مہربان ہو جاتے کسی خوشی کے موقع پر یا خاندان کی کسی تقریب میں پھر مسلسل جملوں اور فقروں کے استعمال سے سب کو محظوظ کرتے، محسن کی منگنی دور کے رشتہ داروں میں ہوئی۔ ہم پہلی دفعہ ان لوگوں سے ملے، خوب خاطر تواضع ہوئی، جب حلوے کو سامنے پایا تو رباعیات کا نزول شروع ہوا، مسلسل حلوے کی توصیف میں مختلف زاویوں سے جملے ارشاد کیے، اب میزبان قدرے شرمندہ اور پریشان نظر آنے لگا، آہستہ سے عرض کیا بھائی ہتھ ہولا رکھو۔ کہنے لگے جب میں اس طرز گفتار سے دور ہو جاؤں گا تو پھر مجھے ختم سمجھنا۔ نماز کے پابند اپنوں اور غیروں کی خصوصاً سادات کی خاموشی سے مدد کرنے والے طبقہ بندی کے برعکس ہر شخص کی عزت کرنا خصوصاً عدالت کے اندر، عدالت سے ایک بوڑھے کو دیکھا جو بار بار چکر لگا رہا ہے اسے بلوایا اپنے ہاتھ سے اس کی درخواست لکھی، پٹواری کو آرڈر جاری کیا، فرد منگوا کر دی اور چائے پلا کر رخصت کیا، حالانکہ کسی حوالے سے اسے نہ جانتے تھے۔ عدالت کا احاطہ جو ایک کاروباری مرکز بنتا جا رہا ہے، کبھی رشوت نہیں لی، بقول رشید نثار ”وہ واحد مجسٹریٹ تھے جو اپنی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر گھومتے تھے۔ حالانکہ وہاں دوسروں کی جیب میں ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔“ انصاف پرور ایسے کہ آفتاب اقبال شمیم نے ان کی کتاب مقتل میں چراغ، کے استعارے کو انہیں کی ذات سے وابستہ کرتے ہوئے کہا کہ ”دراصل وہ عدالتی نظام کو ایک مقتل تصور کرتے تھے جس میں ان کی ذات ایک چراغ کی حیثیت رکھتی تھی۔“

ان کی اخلاقی تربیت میں والدہ اور ماموں راجہ عنایت اللہ چیف اکاؤنٹس آفیسر، پی پی آر کے کردار کو کسی صورت بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جب

ریٹائر ہوئے تو جوہر آباد میں قسطوں پر لیا گیا ایک مکان ان کی ملکیت تھا ماں باپ کے ساتھ وفاداری کی عمدہ مثال قائم کی۔ ماں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر مجھے لکھا کہ ''مجھے زندگی کی کوئی ایسی نماز یاد نہیں پڑتی، جب میں نے حسن اختر اور تمہارے لئے خصوصی دعا نہ کی ہو۔'' والد محترم جوہر نظامی کے ساتھ ان کی رفاقت طویل تھی۔ دونوں شاعری پر نظریاتی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے سے بے تکلف تھے۔ یہ رفاقت وفات تک قائم رہی۔

بچوں سے بہت محبت تھی۔ شادی کے ۱۳ر سال بعد اللہ نے ایک خوبصورت بیٹی دی۔ جو چھ برس کی عمر میں ماں کی شفقت سے محروم ہوگئی۔ بھائی کی زندگی میں وہ دن بڑے اذیت ناک تھے۔ تقریباً ڈیڑھ برس تک ہم دونوں بھائی رباب کی دیکھ بھال میں مصروف رہے، اماں، رباب کی پھپھو اور آنٹی بھی وقفے وقفے سے ہمراہ ہاتھ بٹاتی رہیں۔ مگر دوبارہ بھائی کا گھر بسانے کے علاوہ کوئی حل نظر نہ آیا۔ چنانچہ والد کے ماموں کی لڑکی سے ان کی شادی ہوگئی۔ بیٹے کا ارمان ایک عرصے سے ان کے دل میں مچل رہا تھا۔ ایک بزرگ عالم دین کے کہنے پر ایک طویل دعائیہ مناجات لکھی۔ چنانچہ عمران، جواد کی شکل میں اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا۔ تمام بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بیٹیوں سے زیادہ پیار کیا جبکہ بیٹوں کی محبت کو اپنے دل کا جزو بنائے رکھا۔ رباب اور جواد تو اردو ادب میں بھی نام پیدا کریں گے۔ ہمارے گھر میں والد اور حسن اختر جلیل علمی اعتبار سے ایسے روشن چراغ تھے۔ جن کے سامنے باقی افراد خانہ ہمیشہ بے حیثیت رہے۔ مظفر حسن منصور اور مجھے ان کی وساطت سے شاعری کے بہت سے اسرار و رموز تک رسائی ہوئی۔ ہم والد محترم اور حسن اختر جلیل کے درمیان پیدا ہونے والے علمی اختلافات کا لطف لیا کرتے تھے۔ ایک دن والد جلیل کے تصور جدیدیت سے خاصے برہم تھے۔ ہم نے عرض کی: ''ہمارے گھر کی خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم تمام بھائی ایم۔اے کر چکے ہیں۔ بس ایک بھائی کا دکھ ہے کہ وہ ایم۔اے نہ کر سکے، مگر یہ تو اپنے اپنے رجحان کی بات ہے۔'' والد صاحب بستر پر آرام فرما رہے تھے۔ یہ بات سن کر یکلخت اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے: ''میرا ایک ہی بیٹا صاحب علم ہے اگرچہ تم دونوں پروفیسر کے عہدے پر پہنچ چکے ہو لیکن آج بھی اگر مولانا سبطین صاحب کی کسی کتاب سے اردو کا املا لکھواؤں تو تم دونوں سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ گے۔'' تم حسن اختر کا کیا مقابلہ کرو گے؟

مجھے اور کوثر کو یہ اعزاز ملا کہ مقتل میں چراغ، کی ترتیب بھائی نے ہمارے ذمے لگائی۔ ہم نے غزلوں اور نظموں کے سیٹ تیار کیے اور خصوصی طور پر پہلا سیٹ تیار کرتے ہوئے ان کے ایسے کلام کا انتخاب کیا جو ان کی مقبولیت میں اضافے کا باعث بنے۔ جلیل نے باقی تمام ترتیب ویسے ہی رہنے دی مگر پہلے سیٹ کو درمیان میں رکھ دیا۔ شاید ان کی احتیاط پسندی کا تقاضا یہی تھا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ابتدائی دور کی بیماری کے اثرات ان کی شخصیت میں ہمیشہ موجود رہے، بھیڑ اور ہنگاموں سے دور رہنا، تنہا سفر سے گریز کرنا، پیاس کا زیادہ لگنا، شہرت سے دور بھاگنا اور دفتر سے واپس آکر خود کو گھر کی چار دیواری میں بند رکھنا اگرچہ ان کے معمولات زندگی تھے، مگر زندگی کے آخری حصے میں وہ مواقع ایسے تھے جہاں ان کا طرز عمل ان کی پوری زندگی سے مختلف نظر آیا۔ سفر حج پر تنہا جانا اور تمام سفر کے دوران پر سکون رہنا، مناسک حج کا خوش اسلوبی سے ادا کرنا، ایک معجزے سے کم نہیں کہ اس کا ادراک وہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جنہوں نے ان کے معمولات زندگی کو قریب سے دیکھا۔

والد صاحب نے اپنے گھر کو عزاداری حسین علیہ السلام کا مرکز بنا دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد عام خیال یہ تھا کہ جلیل ان امور کو سرانجام نہ دے پائیں گے، مگر انہوں نے فرش عزا بچھانے سے جلوس کے اختتام تک کے فرائض اپنے ذمے لے لیے اور تمام عزاداروں کے دلوں میں ایک ولولہ تازہ بھر دیا۔ یقیناً وہ سفر آخرت سے پہلے اپنا تمام زاد سفر باندھ چکے تھے۔

کسی کو علم نہ ہو سکا کہ ان کے جسم کی ناتوانی دماغ میں موجود، ٹیومر کی وجہ سے ہے اور جب معلوم ہوا تو اسے نکالنے کے لئے ہونے والا آپریشن جان لیوا ثابت ہوا اور وہ 29 دسمبر 2002ء کو گلبرگ ہسپتال لاہور میں انتقال کر گئے۔ انہیں جوہر آباد میں والدین کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً 67 برس تھی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

....

انشائیہ

بھولے لوگ

پنجابی عاشق رحیل/ اُردو ناز اوکاڑوی

بزرگوں کا قول ہے "بندہ بندے کا دارُو (دوا) ہوتا ہے۔" ضرور ہوتا ہوگا کیونکہ بزرگوں کا کہا ہوا غلط نہیں ہوتا، ان کے بارے ایسا سوچنا بھی بے ادبی کے مترادف ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایام قدیم یعنی پُرانے وقتوں میں تمام باتیں اچھی ہی ہوتی تھیں۔ آپ نے خود بھی اپنے آباء و اجداد سے کہتے سُنا ہوگا: "ہمارے زمانہ میں تو یہ بُرائی بالکل نہ تھی...... " حالانکہ بُرائی تو کبھی نہیں رُکتی" مگر خطائے بُزرگاں گرفتن خطا است" یعنی بزرگوں کی غلطی پکڑنا بھی غلطی میں شمار ہوتا ہے۔ تو اس پر عمل کرتے ہوئے ہمیں چُپ ہی رہنا چاہیے۔ یہ مانا کہ بندے کو بندے کی دوا ہی ہونا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں بلکہ آج کل تو ایک ہی بندہ بہت سارے بندوں کا ؟؟؟ قاتل ہو جاتا ہے تو ہم نے جو ہوش سنبھالی تھی آج سنبھالنا بہت مشکل ہے، سُنا تو یہ بھی ہے کہ یہ دُنیا ہی بندے کے "مارُو" نے شروع کی ہے۔ ہو سکتا ہے اگر وہ مارُو نہ ہوتا تو بندے بندوں کے دارُو بھی نہ ہوتے اور یہ بتانے والے نہ ہوتے کہ دُنیا کی ابتداء کیسے ہوئی، جبکہ راوی بتاتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اماں حوا اور بابا آدم کی جنت میں کی ہوئی غلطی معاف کر دی تو ان کے آپس میں ملاپ کا بندوبست بھی فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو عرش سے فرش تک لا کر ان میں جدائی اور دوری پیدا کر دی تھی۔ اماں حوا کو جدّہ اور ہمارے جدِ امجد بابا جی آدم کو اماں حوا سے دُور مُلک سری لنکا جا اُتارا تھا۔ اس جوڑے کو دوبارہ ملانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ کے نزدیک ایک پہاڑی کو پسند فرمایا تھا۔ پتہ نہیں دونوں کو اس پہاڑی کا کس طرح پتہ چلا۔ جدّہ سے تو یہ پہاڑی نزدیک تھی۔ اماں حوا تو پیدل ہی چلی آئی ہوں گی، مگر بابا آدم کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ کیونکہ راستہ میں سمندر بھی حائل تھا، مگر جب دو پریمیوں کے دلوں میں ملنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے تو راستے میں دریا، سمندر، صحرا اور پہاڑ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ایسے ہی ان کی سچی محبت نے ان کو بھی ان پہاڑی پر ملا دیا۔ ہو سکتا ہے اگر ان کا ملاپ نہ ہوتا تو آج یہ دُنیا وجود میں نہ آتی۔ اگر آ بھی جاتی تو زمین کا انسانوں سے خالی یہ گولہ فرشتوں کی اولاد کے کھیل کود کے لیے گیند کا کام دیتا۔

جس پہاڑی پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دونوں کو ملایا۔ اُس پہاڑی کا نام جبل الرحمہ (رحمت والی پہاڑی) رکھ دیا۔ یوں حقیقی طور پر یہیں سے دُنیا معرضِ وجود میں آئی۔ یہیں ان کے ہاں دو بیٹے ہابیل، قابیل اور بیٹی اقلیمہ پیدا ہوئی۔ جوں ہوتے ہی روزگار کے سلسلہ میں دمشق پہنچے ہوں گے۔

دُنیا کی پہلی لڑائی ایک عورت کی خاطر ہوئی۔ دمشق میں ہی ہوئی۔ ہابیل کی شادی اقلیمہ کے ساتھ ہونے لگی تو قابیل کے دل میں اُس کے لئے رقابت کی چنگاری بھڑک اُٹھی، یوں بھائی کو بھائی کا رقیب ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ شرف اس لیے لکھا کہ یہ دُنیا کا پہلا رقیب تھا اور اسی سے رقابت کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ وہ بھی اقلیمہ سے ہی شادی کا خواہشمند تھا۔ ویسے بھی کوئی اور لڑکی تو تھی ہی نہیں۔ اسی لیے وہ ہابیل کو قتل کر کے ہی بھائی کا قاتل ثابت ہوا تو پھر بابا آدم کے دو بچے باقی رہ گئے تو اُس وقت سے ہی یہ سلوگن ایجاد ہوا کہ "بچے دو ہی اچھے" جس پر آج تک عمل نہ سکا۔ اُسی دور میں کوّے کو "سیانا" عقلمند ہونے کا خطاب بھی ملا تھا شاید یہ عقلمند کوا بھی بابا آدم جی کے ساتھ جنت سے نکالا گیا ہو۔ سیانا ہونے کا خطاب اسے اس لیے ملا کہ اسی نے قابیل کو ہابیل کی نعش دفن کرنے کا طریقہ بتایا تھا۔ اسی طرح کوا جانوروں کا ارسطو بن بیٹھا۔ آج بھی اگر کسی بندے کی عقلمندی کی تعریف کرنی چاہیں یا کرنی پڑے تو اُسے "سیانا کوا" ہی کہا جاتا ہے۔ مگر کوے اس بات سے ناراض ہو جاتے ہیں بندا ان کی عقلمندی کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے اور کیا کبھی انسانوں کی طرح کسی جانور نے کسی جانور کو جان سے مارا ہے؟ یہ میری بڑی تاریخی تحقیق ہے جس پر مجھے اصلی نا سہی ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تو ضرور ملنی چاہیے۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ میں کیا بے کار قصہ چھیڑ کر بیٹھ گیا ہوں۔ میں تو انسانوں کی قسمیں دریافت کرنے بیٹھا تھا صرف دو قسموں "دارو تے مارو" میں ہی پھنس کر رہ گیا ہوں۔ اگر اس وقت میرے ساتھ ایک دوست انشائیہ نگار ہوتے تو وہ اتنی اقسام گنواتے کہ بُرے کو بُرے کے گھر تک پہنچا کر دم لیتے۔ ایک مرتبہ وہ "ٹھگ" پر انشائیہ لکھنے لگے تو انہوں نے ٹھگوں کی اتنی اقسام اور نسلیں گنوا دیں کہ "ڈنگر ڈاکٹرز" کی یونیورسٹی نے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کی پیشکش کر دی۔ حالانکہ وہ پہلے ہی سے ادبی ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے ڈگری وصول کی یا نہیں مگر اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر بھی لکھتے ہیں۔ حالانکہ صرف پی۔ ایچ۔ ڈی لکھ دینا ہی کافی ہے۔ لوگوں کی قسمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے سب سے اچھی قسم "بھولے لوگ" مل گئی ہے۔ اب میں ان کے بھولپن کا ہی ذکر کروں گا۔ کیونکہ ان میں مَیں خود بھی شامل ہوں۔ بھولا ہونا ایک خُوبی گردانی جاتی ہے

کوئی دوست اسے خامی یا بے وقوفی نہ تصور کرے۔ یہ لوگ تو معاشرے کا حُسن ہُوا کرتے ہیں، یہاں میں ایک دو بھولے افراد کا ذکر کروں گا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اپنے مُلک میں ٹی۔وی نشریات نہ تھیں۔ گھروں، دوکانوں اور ہوٹلوں میں ریڈیو کا راج ہوا کرتا تھا۔ گھر سے باہر سینما تو اندر ریڈیو کے پروگرام سب سے بڑی تفریح ہوا کرتے تھے۔ ریڈیو سُننا بھی عیاشی کے زُمرے میں آتا تھا۔ اُن دنوں ریڈیو سیلون نئی نسل کا پسندیدہ ریڈیو چینل سمجھا جاتا تھا۔ اُس دور کی نسل جنہوں نے ریڈیو سیلون کی نشریات سے جہاں اپنے کانوں میں رس گھولے، میں ان کی گونج آج بھی ان کے کانوں میں جلترنگ بجاتی ہوگی کیونکہ ریڈیو سیلون پر نئے نئے انڈین فلموں کے گانوں کے فرمائشی پروگرام چلتے تھے۔ گانوں کے شوقین نوجوان اپنی پسند کے گانے سننے کے لیے بذریعہ خطوط فرمائش بھیجتے اور پھر گانے کی فرمائش کرنے والوں کی فہرست پڑھی جانے پر اپنا نام سُن کر خوشی کا اظہار کرتے۔ ایک روز ہم بھی دو تین دوست اپنے گھر کے ایک کمرے میں بیٹھے، یہ پروگرام سُن رہے تھے۔ ریڈیو ساتھ والے کمرے میں ایک الماری کے نیچے والے خانہ میں رکھا ہوا تھا۔ ہم دوسرے کمرے میں ہونے کی وجہ سے ریڈیو سے آواز ذرا آہستہ آرہی تھی۔ میں نے اپنے ماموں زاد کو کہا کہ ریڈیو کو اُونچا کرنے کو کہا۔ وہ میری بات سُن کر چلا گیا اور جلد ہی واپس آکر کہا میں ریڈیو کو اُونچا کر آیا ہوں۔ وہ ریڈیو تو اُونچا کر آیا مگر آواز پہلے کی طرح آہستہ ہی رہی۔ آواز میں فرق نہ آنے پر میں خود اُٹھ کر اُس کمرہ تک گیا۔ دیکھا تو اُس نے میری بات مانتے ہوئے ریڈیو تو واقعی اُونچا کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے بھولپن سے کام لیتے ہوئے میری بات پر سو فیصد عمل کیا یعنی ریڈیو الماری کے نچلے خانے سے اُٹھا کر اُوپر والے خانہ میں رکھ دیا تھا۔ اس میں بیوقوفی تو میری تھی میں نے اُسے اونچی کے ساتھ لفظ "آواز" تو کہا نہیں تھا۔

بھولپن کا ایک اور دلکشا واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ شہر سے ایک لڑکی کسی گاؤں میں رہنے والی اپنی خالہ کے پاس آئی۔ ایک دن اُس کی خالہ دالان میں بیٹھی کسی ضروری کام میں مصروف تھی۔ باورچی خانہ میں پکنے کے لیے (ہنڈیا) رکھی ہوئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ (ہنڈیا) میں پانی کم رہ جانے کیوجہ سے سالن جل نہ جائے۔ اُس نے لڑکی کو آواز دے کر بُلایا اور کہا "بیٹا دوڑ کے باورچی خانہ میں (ہنڈیا) کو دیکھ آ۔" خالہ کا حکم مانتے ہی ہوڑ کر اندر گئی اور جلد ہی دوڑتی ہوئی واپس آکر کہا: "خالہ جی میں ہنڈیا دیکھ آئی ہوں۔" خالہ کو تسلی ہوگئی کہ وہ ہنڈیا کی طرف سے بے فکر ہو کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد ہنڈیا سے سالن کے جلنے کی بُو آنے لگی۔ خود دوڑ کر باورچی خانہ میں گئی ہنڈیا میں پانی ڈال کر ڈوئی (لکڑی کا چمچہ جو (ہنڈیا) بناتے استعمال کرتے ہیں) سے سالن کو بچالیا اور باہر آکر بھانجی کو ڈانٹتے ہوئے کہا: "تجھے کہا تھا کہ باورچی خانہ میں جا کر ہنڈیا کو دیکھ کر آ۔ تو اسی طرح واپس چلی آئی۔ تجھے ہانڈی (ہنڈیا) دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔"

"قسم اُٹھوا لیں خالہ جی! میں نے باورچی خانہ کے دروازہ میں کھڑے ہو کر کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہنڈیا چولہے پر پڑی ہوئی تھی۔" اُس لڑکی نے بڑی معصومیت اور بھولپن انداز سے منہ بناتے ہوئے کہا اُس کا صحیح جواب سُن کر خالہ سر پیٹ کر رہ گئی۔

لوگوں کی کئی اقسام میں سے آپ کو بھی یہ قسم پسند آئی ہوگی آپ کو بھی ان جیسے بھولے لوگوں یا کرداروں اور سنہری کارناموں سے واسطہ پڑا ہوگا جن کی باغ و بہار قسم کی شخصیات مدتوں یاد رہتی ہیں، ہوسکتا ہے کہ کبھی ہم بھی ان جیسے بھولے بھالے لوگوں میں شمار رہے ہوں۔ ان جیسے معصوم فرشتے معاشرے کو جنت بنائے رکھتے ہوں، مگر آج گھاگ قسم کے لوگوں نے دُنیا کو دوزخ بنا کر اسے رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ایسے لوگ اپنی ہوشیاری چالاکی اور سفاکی سے، ساتھ ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہ لوگ اندر باہر سے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی وجہ سے ہی دُنیا میں منافقت کی فضا پیدا ہوتی ہے اور دُنیا کو دھوکا دینے کے لیے بدصورت چہروں پر نئے چہرے سجا لیتے ہیں۔ اگر سب لوگ ہوشیار، چالاک اور ذہین اور بڑے عقلمند بن جائیں تو ایک دوسرے کے دُکھ کا مداوا کرنا تو درکنار کوئی دوسرے کے ساتھ بات چیت بھی نہ کرے۔

ہمیں بھولے بھالے لوگوں کی بہت ضرورت ہے جن کی وجہ سے دُنیا میں ہنسی مزاح کے مواقع میسّر ہوتے رہیں اور یہ دُنیا رہنے کے قابل نہیں رہے۔

مگر دوستو! میرے خلاف مت ہونا میں نے آپ کو بھلے اور بھولے بننے کو کہا ہے بیوقوف بننے کے لیے نہیں۔

جناب انوار احمد کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ادبی جریدے

"پیلوں" کا افسانہ نمبر شائع ہوگیا ہے۔

معاون مدیران

سید عامر سہیل، محمد عارف، عمران میر، سجاد نعیم

رابطہ: 23 شالیمار کالونی، یونیورسٹی روڈ، ملتان

ارشد شاہین

......حلقہ ارباب ذوق ادبی اور حلقہ ارباب ذوق سیاسی میں تقسیم رہا ہے لیکن اس کی یہ تقسیم نظریاتی تھی جب کہ موجودہ تقسیم ذاتی مفادات پر مبنی ہے جو کسی بھی طور حلقہ یا شعر وادب کے لیے مفید نہیں ہے

حسن عباسی: کیا موجودہ شاعری یکسانیت کا شکار ہے؟

ارشد شاہین: مجموعی صورت حال تو کچھ ایسی ہی ہے لیکن کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جو انفرادی طور پر اس یکسانیت کے ماحول میں بھی اپنی الگ شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

حسن عباسی: کیا اردو ادب کا مستقبل اب فیس بک سے وابستہ ہے یا کتاب کی اہمیت دوبارہ محسوس کی جائے گی؟

ارشد شاہین: اس میں کوئی شک نہیں کہ فیس بک شعر و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اور اس نے شعرا وادبا کو قارئین تک رسائی کا براہ راست موقع فراہم کیا ہے۔ اس کے ذریعے یقیناً کچھ مخصوص افراد کی اجارہ داری ختم ہوئی ہے۔ اب کم از کم یہ ضرور ہے کہ ہر لکھنے والے کو شناخت اور پہچان کا مسئلہ نہیں رہا مگر اس کے باوجود کتاب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ، نہ اب اور نہ مستقبل میں۔ کسی بھی تخلیق کار کے لیے اعتماد اور اعتبار کا ذریعہ ہمیشہ کتاب ہی رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

حسن عباسی: ناروے میں کتنی ادبی تنظیمیں ہیں اور کس قدر فعال ہیں؟ وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق قارئین کو آگاہ کریں۔

ارشد شاہین: ناروے میں ادبی تنظیموں کی تعداد بہت محدود ہے جن میں ایشین آرٹس کونسل ، دریچہ ، حلقہ ارباب ذوق ، پنجابی ادبی سنگت اور شعر و آہنگ قابل ذکر اور فعال ادبی تنظیمیں ہیں جو وقتاً فوقتاً مشاعروں ، ادبی تقریبات اور محافل موسیقی کا اہتمام کرتی رہتی ہیں جن میں مقامی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ پاکستان اور یورپ کے دیگر ممالک سے بھی شاعر اور ادیب شرکت کرتے رہتے ہیں۔

حسن عباسی: آپ نے احمد مشتاق کے فن اور شخصیت پر ایم فل کا مقالہ لکھا ہے۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ احمد مشتاق ناصر کاظمی سے بڑا شاعر ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

ارشد شاہین: اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد مشتاق اور ناصر کاظمی دونوں بڑے شعرا ہیں۔ دونوں کا مزاج اور فضا یکساں ہونے کے باوجود احمد مشتاق نے اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ بڑے چھوٹے کی بحث سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ناقدین نے ناصر کاظمی کی نسبت احمد مشتاق کو وہ توجہ نہیں دی جس کے وہ حق دار تھے۔ وہ یقیناً جدید اردو غزل کے اہم ترین نمائندہ اور ایک رجحان ساز شاعر ہیں اور انھیں ان کا جائز مقام ملنا چاہیے۔

حسن عباسی: ناروے میں رہ کر بہتر شاعری ہوتی ہے یا پاکستان میں؟

ارشد شاہین: ناروے ہو یا پاکستان کسی بھی جگہ شاعری کے لیے بنیادی طور پر انسان کا شاعر ہونا ضروری ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ شاعری کے لیے جس ماحول اور فضا کی ضرورت ہوتی ہے وہ پاکستان ہی میں دستیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن آج کل ذرائع ابلاغ کی ترقی اور خصوصاً فیس بک کی ایجاد نے بیرون ملک مقیم شاعروں کو بھی اس ماحول سے جڑے رہنے کا موقع فراہم کیا ہے لہٰذا یہاں رہ کر بھی بہتر شاعری کی جا سکتی ہے۔

حسن عباسی: کیا وطن سے دوری کا احساس شاعری کو مہمیز عطا کرتا ہے؟

ارشد شاہین: جی بالکل وطن سے دوری کا احساس یقیناً شاعری کو مہمیز عطا کرتا ہے۔ ایک نئے ماحول کے تجربات و کیفیات اور وطن سے دوری کے احساس کی آمیزش شاعری میں زندگی کی دریافت کا بھرپور موقع فراہم کرتی ہے۔ اور آپ کی شاعری میں نت نئے مضامین در آتے ہیں اور امکانات کے کئی در وا ہوتے ہیں۔

حسن عباسی: خالد احمد اور بیاض سے آپ کی گہری وابستگی رہی ان کی شخصیت اور بیاض کے حوالے سے کچھ یادیں تازہ کیجیے۔

ارشد شاہین: یوں تو مرشد خالد احمد سے محبت رکھنے والا ہر شخص ہی ان سے بہت قربت محسوس کرتا ہے مگر میں ان چند لوگوں میں سے ہوں جنھیں نہ صرف ان کی محبت ، شفقت اور رہنمائی سب سے زیادہ نصیب رہی بلکہ انھوں نے مجھے اپنا باقاعدہ شاگرد ہونے کا اعزاز بھی عطا کیا۔ انھوں نے بیک وقت تین نسلوں کی

تربیت کا فریضہ انجام دیا اور بہت سے لوگوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ، یہ سلسلہ الفضل ہوٹل لکشمی چوک، پاک ٹی ہاؤس، بیاض کے آفس اور الحمرا ادبی بیٹھک تک پھیلا ہوا ہے۔اس عظیم شخص نے تمام عمر خود کو تشنگان علم و ادب کی تربیت کے لیے دستیاب رکھا ان کے ہم عصروں میں یہ تخصص صرف انھی کو حاصل ہے۔وہ انتہائی درویش صفت انسان تھے۔اپنے ارد گرد بیٹھنے والوں کی اپنے مخصوص انداز اور غیر محسوس طریقے سے تربیت کرنا ان کا شب و روز کا معمول تھا۔انتہائی دلچسپ اور مرنجاں مرنج شخصیت کو سمجھنے کا دعوی کرنا سفید جھوٹ بولنے کے مترادف ہے۔ ماہنامہ بیاض کا اجرا اور سالہا سال تک اس کا تسلسل ان کی ادبی خدمات پر دال ہے۔وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ اور تحریک تھے۔مختصر یہ کہ اگر آج ادبی حوالے سے میں کسی قابل ہوں تو وہ انھی کی شفقت و رہنمائی کی بدولت ہوں۔اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔

حسن عباسی: آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مستقبل میں ادبی حوالے سے کیا کام کر رہے ہیں؟

ارشد شاہین: میرا شاعری کا ایک مجموعہ "اداس میں چاندنی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جب کہ احمد مشتاق کے فن اور شخصیت پر ایم فل کا مقالہ، یورپ کا سفرنامہ "آخری کنارے تک" اور دوسرا شعری مجموعہ "دریا سفر میں ہے" اشاعت کے مراحل میں ہے۔اس کے علاوہ "سکنڈے نیویا میں اردو زبان و ادب" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہا ہوں جو بعض ناگزیر وجوہ اور قانونی پیچیدگیوں کے باعث تعطل کا شکار ہے۔ مبارک احمد کی کتاب "کلیاتِ مبارک" کی ترتیب و تدوین بھی میرے کریڈٹ پر ہے۔

حسن عباسی: کیا کبھی سفرنامہ لکھنے کا خیال آیا؟

ارشد شاہین: جی جیسا کہ پہلے بھی بتا چکا ہوں میرا یورپ کا سفرنامہ "آخری کنارے تک" اشاعت کے لیے بالکل تیار ہے۔

حسن عباسی: کس موضوع پر کتب شوق سے پڑھتے ہیں؟

ارشد شاہین: زیادہ تر شعر و ادب اور تنقید سے متعلق کتابیں شوق سے پڑھتا ہوں مگر دیگر علوم و فنون کی کتب کو بھی اپنے لیے شجر ممنوعہ نہیں سمجھتا۔میرے نزدیک لکھنے کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے ورنہ آپ کی تخلیق جمود کا شکار ہو جائے گی۔

حسن عباسی: پاکستان میں دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے شاعروں اور ادیبوں کے کردار سے مطمئن ہیں؟انھیں کیا کرنا چاہیے؟

ارشد شاہین: دہشت گردی کے خاتمے کے لیے شاعر و ادیب کردار ادا تو کر رہے ہیں مگر ان کی طرف سے اس سے کہیں زیادہ کی توقع ہے۔شاعر یا ادیب کسی بھی معاشرے کا دماغ اور امن و محبت اور بھائی چارے کا پیامبر ہوتا ہے لہذا ہر لکھنے والے کو وطن عزیز میں موجود شدت پسندی کے خلاف اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔

حسن عباسی: کتنی محبتیں کر چکے ہیں اور کتنی مزید کرنے کا ارادہ ہے؟

ارشد شاہین: محبت کائنات کا ازلی اور دائمی جذبہ ہے اور یہی روح کائنات ہے لہذا انسان کو اسی میں زندگی بسر کرنی چاہیے۔جس محبت سے متعلق آپ نے سوال کیا ہے تو عرض ہے کہ میرے نزدیک انسان کا آئیڈیل بھی کسی ایک پیکر میں ڈھلا ڈھلایا نہیں ملتا بلکہ اس کے مختلف حصے مختلف لوگوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اب تک کئی محبتیں کر چکا ہوں اور مزید کئی محبتیں ہو سکتی ہیں بقول احمد فراز

ہم نے جس جس کو بھی چاہا ترے ہجراں میں وہ لوگ
آتے جاتے ہوئے موسم تھے زمانہ تو تھا

لہذا آئیڈیل کی تلاش میں محبت کا یہ سفر زندگی کی آخری سانس تک جاری رہے گا۔

حسن عباسی: تین پسندیدہ اشعار؟

عشق اذیت ناک بھی ہے اور صبر طلب بھی
لیکن اس سے آدمی تازہ دم رہتا ہے

....

دکھ ہے تو یہ کہ اک بھی گواہی نہ مل سکی
حالانکہ اک ہجوم میں مارا گیا مجھے

....

پر پیچ راستوں کی اذیت بجا مگر
سچ پوچھیے تو اپنا گزارہ سفر میں ہے

....

حسن عباسی: ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ارشد شاہین: میرا پیغام یہی ہے کہ آپس کی رنجشیں اور نفرتیں بھلا کر وطن عزیز میں امن کے لیے محبتیں بانٹیں۔جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اس دھرتی کو جنت کا نمونہ بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔

مختصر ادبی خبریں

☆ اُردو کے نامور افسانہ نویس، ناول نگار اور کالم نویس انتظار حسین گزشتہ دنوں خالقِ حقیقی سے جا ملے اُن کی یاد میں لاہور سمیت پوری دُنیا میں ادبی تنظیموں نے تعزیتی اجلاسوں کا انعقاد کیا۔

☆ نثری نظم کے حوالے سے پہچان بنانے والی پنجابی کی منفرد ادیبہ نسرین انجم بھٹی لاہور میں انتقال کر گئیں اُن کی وفات پر اُردو اور پنجابی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی اُن کی یاد میں بھی مختلف تنظیموں نے تعزیتی اجلاس منعقد کیے۔

☆ نامور ناول نگار اور ڈرامہ نویس ثریا بجیا گزشتہ دنوں کراچی میں وفات پا گئیں۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات نے اُن کے انتقال پر گہرے دُکھ کا اظہار کیا اور اُن کی ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

☆ برصغیر پاک و ہند کے نامور شاعر ندا فاضلی ممبئی بھارت میں وفات پا گئے انہوں نے فلموں کے لیے مقبولِ عام نغمے لکھے اور اپنی منفرد شاعری کے باعث پوری دُنیا میں اپنی پہچان رکھتے تھے۔

☆ اُردو کے نامور شاعر مختار جاوید بھی گزشتہ دنوں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، قتیل شفائی اور بہت سے سینئر شاعروں کے ہمعصر تھے۔

☆ ملتان میں اُردو غزل کے نہایت معتبر شاعر عارف منصور اہلِ ادب کو داغِ مفارقت دے گئے۔ عارف منصور (مرحوم) اپنی خوب صورت شاعری کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

☆ انڈیا (پٹنہ) میں ذہنِ جدید کے مدیر زبیر رضوی انتقال کر گئے، اُن کی وفات پر ادبی حلقوں نے گہرے دُکھ اور رنج کا اظہار کیا۔

☆ پاک ٹی ہاؤس میں بیادِ حفیظ تائب ایک پُروقار نعتیہ محفلِ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت ریاض حسین زیدی (ساہیوال) نے کی، مہمانِ خصوصی ایوارڈ یافتہ شاعر علی رضا تھے۔

☆ ماہنامہ ارژنگ اور ''پہچان'' کے زیرِ اہتمام ارم بتول (جرمنی) اور حافظ احمد (اسپین) کے اعزاز میں ایک عشائیے کا انعقاد کیا گیا، جس میں لاہور کے اہم ادیبوں نے شرکت کی۔

☆ منہاج القرآن یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے ناظم ڈاکٹر مختار عزمی کے مضامین پر مشتمل کتاب ''پہچان'' کے زاویے کی تقریبِ پذیرائی اکیڈمی ادبیات لاہور کے دفتر میں منعقد ہوئی۔

☆ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق اور UMT کی میزبانی میں ہر ماہ ''لاہوری ناشتے'' کا اہتمام باقاعدگی سے کیا جا رہا ہے، اس موقع پر کسی کتاب کی تقریبِ پزیرائی کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔

☆ نامور مزاح نگار، کالم نویس، ڈرامہ رائٹر اور شاعر عطاء الحق قاسمی نے پی ٹی وی میں بحیثیت چیئرمین ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔

☆ جشنِ بہاراں کے عنوان سے گزشتہ دنوں پی ٹی وی لاہور میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت ڈاکٹر خورشید رضوی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد تھے۔ پنجاب کے مختلف شہروں سے 20 کے قریب جدید شعراء نے اس مشاعرے میں شرکت کی۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: کہکشانِ نعت/شاعر: محمد بشیر رزمی/صفحات: 216/قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: تحسین فراقی، لاہور۔ ۱۱ مئی ۲۰۱۵ء

ناشر: کانٹی نینٹل سٹار پبلشرز، غزنی سٹریٹ، لاہور

تخلیقِ پاکستان کے بعد صنفِ نعت ایک نئی اور بھرپور تخلیقی جہت سے بہرہ ور ہوئی ہے اور نعت گو شعراء کا ایک بڑھتا ہوا سبک رفتار قافلہ وجود میں آ چکا ہے۔ بشیر رزمی صاحب بھی اسی فیض یافتہ اور مبارک کارواں کے ایک قابلِ ذکر فرد ہیں۔ رزمی صاحب کا اچھے غزل گوؤں میں تو شمار ہوتا ہی ہے، وہ نعت گوئی کے میدان میں بھی بند نہیں۔ ''کہکشانِ نعت'' کی صورت میں ان کا پیشِ نظر مجموعہ حضور اکرم ﷺ سے ان کی گہری محبت و عقیدت کا مظہر ہے۔ انہوں نے آدابِ نعت کو ملحوظ رکھ کر شعر کہے ہیں اور ان میں اظہار کی سہولت اور برجستگی کے اچھے نمونے فراہم کیے ہیں۔ خود ''کہکشانِ نعت'' کی ترکیب بھی قابلِ داد ہے جو صنفِ نعت کی لاانتہا اور بے کنار وسعتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور قرآنی فرمان ورفعنا لک ذکرک کی یاد دلاتی ہے۔ رزمی صاحب کا کیا اچھا مصرع ہے:

مرا دل ہو چکا ہے نعت آباد

اس مصرعے کی صداقت ''کہکشانِ نعت'' میں جا بجا دیکھی جا سکتی ہے۔ مبارک ہے ایسے تخلیق کاروں کا وجود جن کے دل نعت کے نور و نکہت سے منور اور آباد ہیں۔ ''کہکشانِ نعت'' اُردو کے نعتیہ ادب میں ایک عمدہ اضافہ کہی جا سکتی ہے۔

....

نام کتاب: جلوہ ہائے جمال / مصنف: تفاخر محمود گوندل/صفحات: 302/قیمت: 500روپے/فلیپ نگار: ڈاکٹر عبدالقدیر خان

ناشر: ماورا پبلی کیشنز، مال روڈ، لاہور

فقید المثال مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے ایک شعر اپنی بے ساختہ شاعری کے بارے میں کہا تھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

پروفیسر تفاخر محمود گوندل کی زیرِ مطالعہ کتاب جلوہ ہائے جمال ''سفرنامہ حجاز و نعتیہ مجموعہ'' بھی یہی تاثر دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے تفاخر صاحب بس کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے اور روحانی طور پر یہ تمام مضمون ان کے قلم سے نکلتا رہا۔ کسی بھی روح افزا کلام و شاعری کے لیے روحانی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جس طرح رب العزت نے علامہ اقبال کی شکوہ جواب شکوہ لکھنے میں رہنمائی فرمائی، اسی طرح اللہ رب العزت نے اس کتاب اور نعتیہ مجموعہ ترتیب کرنے میں رہنمائی فرمائی ہے۔ ان کے ہر ہر لفظ ہر ہر جملہ سے ان کی اللہ تعالیٰ سے اور اس کے پیارے نبیؐ سے والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ جس تفصیل، محبت اور خلوص سے آپ نے اپنے سفرنامہ کو تحریر کیا ہے وہ پڑھنے والے کو بھی مدہوش و بے خود کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جس نیک کام کی بھی خواہش کرے اور اللہ رب العزت سے دعا مانگے وہ یقیناً قبول ہو جاتی ہے۔ پروفیسر تفاخر کی داستان پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آہستہ آہستہ ان کے لیے راہ ہموار کر دی اور اس سعادت سے نواز دیا۔ اللہ تعالیٰ ان پر ان کے تمام عزیز و اقارب پر اپنا رحم و کرم قائم رکھے۔ آمین ثم آمین!!!

....

نام کتاب: تہمت / شاعر: شہزاد بیگ / صفحات: 144 / قیمت: 300 روپے / فلیپ نگار: ڈاکٹر خورشید رضوی

ناشر: اکائی پبلشرز، فیصل آباد / لاہور

شہزاد بیگ کی دیداور شنید کے بعد اس کی چند غزلیں نظر سے گذریں۔ اندازہ ہوا کہ غزل اس کے مزاج میں رچی بسی ہے اور اُس کے اشعار ثقل اور گنجلک سے پاک، رواں دواں آہنگ رکھتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا شہر خاشاک اور میری آنکھیں کے عنوان سے اُس کے دو شعری مجموعے داد تحسین پا چکے ہیں اور اب یہ تیسرا مجموعہ تہمت آپ کے سامنے ہے۔
زندگی ہمیشہ سے بے ثبات تھی مگر آج کے دور میں اس کی بے ثباتی کا شعور روح عصر کی سی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ یہ شعور شہزاد بیگ کی غزل میں جا بجا اُبھرتا ہے۔

ہر کوئی ہاتھ میں تلوار لیے بیٹھا ہے
میں تو جیسے کسی مقتل میں اُتارا ہوا ہوں
یہ ہوا ہی ہمیں لے جائے گی شہزاد کہیں
ریت پر نقش کی مانند اُبھارا ہوا ہوں

مگر دیوار کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہو اس کا ایک سایہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ غم دوراں کے پہلو میں غم جاناں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رکھتا ہے۔ شہزاد بیگ کے ہاں محبت صورت سے نہیں ذات سے کی جاتی ہے۔ وہ اصل بھی ہے اور خسارہ بھی۔ آباد بھی کرتی ہے اور برباد بھی۔
شہزاد بیگ کی غزل کا ایک عمیق فلسفہ بھی ہے جس میں اپنے وجود کی نہ جانے کا کھوج ملتا ہے اور معاصر ہجوم میں اپنی اجنبیت کا احساس۔۔۔ مگر اب یہ سب کچھ خود پر گزارنے کے لیے کتاب کھولیے اور ورق در ورق اُس کے جہان معنی کی سیر کیجیے۔ یقیناً یہ مجموعہ بھی پہلے دو مجموعوں کی طرح آپ کو پسند آئے گا۔

نام کتاب: شبداں دے چہرے / شاعر: روندر روی / صفحات: 96 / قیمت: 200 روپے / فلیپ نگار: پروفیسر عاشق رحیل

ناشر: گلشن ادب پبلیکیشنز، لاہور

"روندر روی ہورِیں" بہت مہان لکھاری انسان ہون دے نال نال بہت سچے تے پیار ونڈن والے انسان نیں۔ ایہناں دی ایسے خوبی نے پوری دنیا وچ اپنے دوستاں، مداحاں تے چاہون والیاں دا اک وسیع حلقہ پیدا کر رکھیا اے، جو اک دفعہ وی اوہناں نال مل لوے اوہ اوہناں دے ای گُن گاوندا رہندا اے۔

....

نام کتاب: وہ اک تارا محبت کا / شاعرہ: صفیہ سلطانہ مغل / صفحات: 144 / قیمت: 200 روپے / فلیپ نگار: امجد اسلام امجد

ناشر: فوزیہ مغل، مغل پبلشنگ ہاؤس، یاسر بلاک نشتر کالونی، فیروزپور روڈ، لاہور

صفیہ سلطانہ کی شاعری میں سلاست بھی ہے اور روانی بھی، ان کے انداز بیاں میں تشبیہات اور استعارات ملیں گے، فصاحت اور بلاغت کا رنگ بھی وہ اس دور کی شاعری میں نام نہاد جدید پرستوں کے برعکس اپنی قدیم شعری، روایات کے دائرے میں رہ کر اپنے الفاظ کو نئی معنویت کا پیراہن عطا کرنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ اردو ادب کی استاد ہونے کے ناتے انہیں عام لفظوں سے خاص مطالب اخذ کرنے کا فن بخوبی آتا ہے۔

سنبھالو پیار یہ اپنا فقط دو ہی دن کا ہے
کہ ان مکڑی کے جالوں کی ضرورت اب نہیں مجھ کو

وہ آج کے دور کی معصوم غم ہیں، کیونکہ ان کے کلام میں حسرت دیاس نے کوئی مصنوعی کیفیت پیدا نہیں کی، بلکہ صفیہ نے کلام میں معاشرے کے دیئے زخم نارسائی کو واسوخت اور ہجو میں ڈھالنے کی بجائے اس رنج والم سے نہ صرف خود حظ اٹھایا ہے بلکہ قاری کو بھی دعوت غم دی ہے میں تو اس امر پہ حیران ہوں کہ جب ان کی نثری نظمیں نہیں، ہرگز نہیں، کوئی بات کرو، ویڈنگ کارڈ اور چند غزلیں جو تذکیر کے تکلم میں ہیں انہوں نے عورت ہو کر مرد کی زبان میں جو مکالمہ کیا ہے وہ کمال ہے۔ یہ ملکہ بہت کم شاعرات کو حاصل ہے۔ وہ اپنے سے زیادہ مرد کے احساسات کو بہ زبان شاعر اُجاگر کرتی نظر آتی ہیں یہی ان کی شاعری کا وصف ہے۔ جس کے باعث دنیائے شعر و ادب میں الگ مقام مل سکتا ہے۔

....

نام کتاب: ہجر دا موسم / شاعر: اعجاز اللہ ناز / صفحات: 152 / قیمت: 300 روپے / فلیپ نگار: نذیر قیصر

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، مزنگ روڈ، لاہور

امرتا پریتم نے امروز نال اوشو (گرو رجنیش) بارے گل بات ہوری سی، امرتا نے آکھیا ساڈی ٹریجڈی ایہہ ہے کہ اسیں مذہبی بار اسانوں روحانی ہونا چاہیدا ہے۔ دنیا دی ساری وڈی شاعری رُوحانی ہوندی ہے۔ پر پنجابی شاعری تے رُوحانیت دیا ای ہوندی اے۔ بلھے شاہ، مادھولال حسین، میاں محمد بخش، سلطان باہوتوں لے کے وارث شاہ تک سارے بچے موتی منج دی رسی وچ ای پروئے ہوئے نیں۔ قلبوت دے بغیر رُوح تے رُوح دے بغیر قلبوت دوویں بیکار نیں۔ منج دی رسی ٹٹ جاوے تے بچے موتی مٹی رچ رُل جاندے نیں۔ دانتے دی ڈی وائن کامیڈی، ملٹن دی پیراڈائز لاسٹ، ایلیٹ دی ویسٹ لینڈ، ایہہ ساریاں تحریراں منج دی رسی وچ پروئیاں ہوئیاں نیں۔ ایس گل نوں اگے ودھان دا مقصد ایہہ ہے کہ اج دا عہد شریعت دا عہد نہیں۔ طریقت دا عہد ہے۔ طریقت دی نویں تصوف دی جیہدے وچ پرانے ملبے نوں جھاڑ کے اک نواں انسان طلوع ہوندا ہے۔ اج دے نویں شاعر دا سب توں بنیادی تے وڈا کم ایہہ ہے کہ اوہ نویں صوفی وانگ اپنے شبداں دیاں ڈھیاں چھاواں سب انساناں وچ برابر ونڈے۔ وڈے شاعر دے شبداں دا کوئی دھرم نہیں ہوندا تے اوہدے شبد کدے مردے نہیں، ہمیش زندہ رہندے نیں تے لوکاں نوں زندگی دیندے نیں۔

اعجاز اللہ ناز دی شاعری ایسے ہی شبداں دی شاعری ہے جیہدے وچ انسان، رنگاں، نسلاں تے دھرماں توں اُتانہہ اُٹھ کے وشال اسمان ول جھاتی پاندا ہے۔ جیہدے چن، سورج تے ستارے اپنی روشنی سارے اسماناں تے چھکا ونڈے نیں۔ جیہدے بدل ساری دھرتی تے بارش کردے نیں۔ اعجاز اللہ ناز دی شاعری دے چن، سورج، ستارے تے بدل وی وشال اسمان دی طرحاں اج دے صوفی دا خواب نیں۔ اوہ خواب جیہدے وچ ساری دھرتی دے لوکی رب دا کنبہ نیں۔ صوفی دا خواب محبت توں بغیر پورا نہیں ہوندا۔ اعجاز اللہ ناز دی شاعری محبت دے رنگاں تے شبداں نال کٹورے دے کناریاں تیک لبالب بھری ہوئی ہے۔ اج دے انسان لئی ایسی ہی شاعری ہونی چاہیدی ہے۔

....

نام کتاب: بشارتیں / شاعر: بشیر رحمانی / صفحات: 152 / قیمت: 250 روپے / فلیپ نگار: احمد ندیم قاسمی

ناشر: رحمانیہ کتاب مرکز، لاہور

یہ نعت نگاری کا دور ہے۔ بے شمار شعراء نعت کہہ رہے ہیں۔ ان کا موضوع ایک ہے اور وہ حضورؐ کی ذات پاک ہے۔ فرق انداز اظہار کا ہے اور بشیر رحمانی کا انداز دیگر شعراء سے اس لیے مختلف ہے کہ اُن کی نعت میں اِدھر اُدھر کا شاید ہی کوئی ذکر راہ پاتا ہے۔ وہ عقیدت اور صرف عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اس لیے انہیں اظہار محبت، اظہار عقیدت، اظہار وارفتگی میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی اور عالم وارفتگی میں بھی حد ادب کا بطور خاص خیال رکھتے ہیں۔ یوں بشیر رحمانی کی نعت، نعتوں کے ہجوم میں ایک قابل تحسین انفرادیت کی حامل ہے۔

....

نام کتاب: التفات / شاعر: ناصر زیدی / صفحات: 192 / قیمت: 300 روپے / فلیپ نگار: ڈاکٹر شان الحق حقی

ناشر: سادات پبلی کیشنز، لاہور

ملٹن کا قول ہے کہ شاعر کو اپنی ذات سے بھی ایک نظم کی طرح ہونا چاہیے:

A Poet ought to be a poem himself

ملٹن کی اس سے جو کچھ بھی مراد ہو، میں اپنی دانست میں ناصر زیدی کو اس کی جیتی جاگتی تعبیر سمجھتا ہوں، یعنی خوش آہنگی اور لطفِ کلام، جس سے اُن کی ذات عبارت ہے، کچھ ایسا ہی تاثر رکھتی ہے، لیکن یہ بھی اُن کی یا اُن کی شاعری کی مکمل تعریف نہیں۔ حُسنِ توازن کے لیے خلوص اور جذبے کی حرارت بھی ضروری ہے اور ان سب کا خلاصہ ہے کمال – وہ سچ مچ کمال کے آدمی ہیں۔ کمال کا پہلو اُن کی ہر دل عزیز شخصیت میں بھی موجود ہے اور کلام میں بھی، جس سے میں پچھلی تین دہائیوں سے لطف لیتا رہا ہوں اور اسے پروان چڑھتے بھی دیکھا ہے۔ "ڈوبتے چاند کا منظر" اور "وصال" سے لے کر "وارفتگی" اور "التفات" تک ایک ارتقائی صورت نظر آتی ہے۔ رومان تو کلام میں اب بھی رچا ہوا ہے جو غزل کی جان اور جوہر ہے۔ اس کے ساتھ فکر کی آمیزش، لہجے کی توانائی اور فنی پختگی بھی نقطۂ عروج پر ہے۔ اس سے میری مراد کوری استادانہ رَوِش نہیں، بلکہ وہ رسیدگی جہاں شاعر اعتماد کے ساتھ ندرتِ اظہار کو کام میں لا سکتا ہے۔ تخیلات کے ساتھ پیرایۂ اظہار میں بھی ایک نیا پن، جسے ادب میں اضافہ کہا جا سکے۔

ناصر زیدی کے کلام میں پڑھنے والوں کو نئے فکری رویّوں کے ساتھ محبت کی بہت سی واردات اور زندگی کے بہت سے تجربات کی عکاسی ملے گی۔ کچھ اچھوتی اور کچھ مانوس یا اپنے ہی دل کی آوازیں۔ یہ کلام عام فہم بھی ہے، باوزن اور باوقار بھی، سوچ کو متحرک کرنے کے ساتھ گانے اور گنگنانے کے قابل۔

....

نام کتاب: امروز / مصنف: سلیم پاشا / صفحات: 104 / قیمت: 200 روپے / فلیپ نگار: انور سن رائے

ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، مزنگ روڈ، لاہور

امروز: محبت دا لوک گیت جنہوں تاں دی لوڑ نہیں

کے عنوان سے سلیم پاشا نے امروز سے ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ سلیم پاشا مصور اور شاعر ہیں لیکن بدقسمتی سے مجھے ان کی مصوری دیکھنے اور شاعری پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن ان کی یہ تحریر ایک تخلیقی سفرنامہ کہلانے کی حق دار اور بڑی جان دار ہے۔ اسی میں انہوں نے ۲۰۰۲ء میں لکھی جانے والی امرتا پریتم کی آخری نظم بھی دی ہے۔ اس تحریر میں کئی چیزیں خاصے کی ہیں، لیکن اسے امروز کے حوالے سے سلیم پاشا کی تحریر اور ان کے سفرنامہ بھارت کی بنا پر خریدا جا سکتا ہے۔

....

نام کتاب: دامِ خیال / شاعر: سید سعید نقوی / صفحات: 160 / قیمت: 400 روپے / فلیپ نگار: امجد اسلام امجد

ناشر: اسلامک بک سنٹر، جلال دین ٹرسٹ بلڈنگ، چوک اُردو بازار، لاہور

فرحت پروین کے بعد ڈاکٹر سعید نقوی ہمارے دوسرے ایسے افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے بطور شاعر بھی ادبی دنیا میں اپنی آمد کا اعلان باقاعدہ شعری مجموعے کی شکل میں کیا ہے۔ شاعر اور افسانہ نگاری کا یہ سمبندھ کوئی ایسا نیا اور انوکھا بھی نہیں کہ احمد ندیم قاسمی اور گلزار سمیت کئی نامور لکھاری اس کی کامیاب مثالیں پیش کر چکے ہیں۔
ڈاکٹر سعید نقوی اکثر و بیشتر مختصر طوالت کی کہانیاں لکھتے ہیں ان کی یہ اختصار پسندی شاعری میں بھی چھوٹی بحروں کے وافر استعمال کی شکل میں سامنے آئی ہے، لیکن افسانے کی تجنلک شاعری میں آ کر سہل ممتنع میں ڈھل گئی ہے کہ وہ بہت رواں بحروں میں سامنے کی باتیں بڑے مزے سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ فنی اعتبار سے کہیں کہیں وہ اٹکتے اور بھٹکتے ضرور ہیں، مگر مجموعی طور پر تاثر عام طور پر خوشگوار اور ہموار ہی رہتا ہے۔ دعا ہے کہ رب کریم ان کی شاعری کو بھی ان کے افسانوں کی طرح سے بہرہ ور اور ہمکنار کرے۔

....

نام کتاب: فقط مجھ پہ عیاں ہوتا ہے / شاعر: طارق محمود طارق / صفحات: 160 / قیمت: 300 روپے / فلیپ نگار: ناز اوکاڑوی

ناشر: فجر پبلی کیشنز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

طارق محمود طارق سے میرا تعارف بدر سیماب کے ذریعے ہوا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں بھی کویت میں قیام پذیر تھا۔

طارق محمود نہ صرف اپنے اخلاق و کردار میں یکتا بل کہ منجھا ہوا شاعر ہے جیسے فلک پر ستارے اپنی مدت پوری کر کے اپنے ہم جولیوں سے بچھڑ رہے ہوتے ہیں۔ وہاں ان کی جگہ نئے ستاروں کی آمد کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ادبی اُفق پر بھی نئے ستاروں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ طارق محمود بھی ادبی آسمان پر جگمگانے والا وہ ستارا ہے جس کی شاعری کی چکا چوند کسی ستارے سے کم نہیں۔ ان کی شاعری میں تمام تر لوازمات ملتے ہیں جو ان کے مطالعے کی غمازی کرتے ہیں۔ طارق محمود طارق کسی بھی اچھے شاعر کی طرح لفظوں کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ تشبیہات، استعارے، تلمیحات، اشارے، کنایے شاعری کا حسن ہوتے ہیں اور یہ حسن طارق محمود کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ طارق محمود نے اپنے پہلے مجموعہ میں تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، نعت، سلام، غزل، نظم، قطعات و فردیات کے ذریعہ اپنے قارئین کو ایک بھرپور مجموعہ پڑھنے کے لیے دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ "فقط مجھ پہ عیاں ہوتا ہے" شائقین ادب میں ضرور سراہا جائے گا۔

طارق محمود طارق کو ان کے پہلے مجموعہ پر ڈھیروں مبارک باد۔

....

نام کتاب: لفظوں کی ثقافت کا نظریہ اور ترجمہ کامل/تحقیق و تجزیہ: خالد محمود خان/صفحات: 320/ قیمت: 540 روپے/فلیپ نگار: ڈاکٹر محمد ساجد خان

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

خالد محمود خان نے تراجم سے کام شروع کیا تھا۔ اس کے تراجم میں نیلسن منڈیلا کی خودنوشت سوانح عمری Long Walk to Freedom کا ترجمہ "آزادی کا طویل سفر" سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کے بعد پائیلو کوہیلو کے مشہورِ زمانہ آفاقی ناول Alchemist کا ترجمہ "کیمیا گر" کے عنوان سے کیا جو بعد میں "الکیمسٹ" کے نام سے بھی شائع ہوا۔ اس ناول کی وہ خوبی ابھی تک دریافت نہیں ہو سکی جس کی وجہ سے اردو زبان میں اس کے کم و بیش چھ سے آٹھ تراجم ہو چکے ہوں گے۔ ہٹلر کی دوست ایوا بران کی ڈائری کا ترجمہ بھی اردو ادب میں اہم اضافہ ہے۔ خالد محمود خان نے ایوا بران کی ڈائری کے ترجمہ کے ساتھ کوئی بارہ تحقیقی مضامین کا تعارف اور اضافہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے افسانے "تیری کہانی میری" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں اور ایک غیر مطبوعہ ڈرامہ "ورق شاپ" کے عنوان سے بھی لکھا گیا ہے۔ "یادِ یار مہرباں" کے نام سے اپنے مرحوم دوست جمیل احمد قاسمی کی شخصیت، اُس کا معاشرتی ماحول اور اُس عہد کی خانگی اقدار کا ذکر کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب "فن ترجمہ نگاری: لفظوں کی ثقافت کا نظریہ اور ترجمہ کامل" پر بہت ہی وقیع اور بسیط تحقیق پیش کی گئی ہے۔ ترجمہ کے متعلق اس سائنسی تحقیق میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر لفظ اپنی ثقافت رکھتا ہے اور اگر ترجمہ نگار لفظوں کی ثقافت کو سمجھتا ہے تو وہ ترجمہ کو کامل بنا سکتا ہے۔ اس تحقیق میں لفظوں کی ثقافت کے نظریہ کا اطلاق شمس الرحمٰن فاروقی کے ترجمہ The Mirror of Beauty پر کیا گیا ہے۔

میری آرزو ہے کہ وہ فن ترجمہ کے مختلف موضوعات پر تحقیق جاری رکھے۔ اردو ادب میں یہ اُس کا ذاتی حصہ ہے اور بہت ہی معنی خیز اور احسن ہے۔ میں اُسے اس کاوش پر خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں مگر وہ تحسین تو بے شمار لوگوں سے وصول کرتا ہے اور "خراج" میں ادا نہیں کر سکتا۔

....

نام کتاب: مابعد جدیدیت/مرتب: ڈاکٹر ناصر عباس نیر/صفحات: 464/ قیمت: 750 روپے/فلیپ نگار: ڈاکٹر وزیر آغا

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

مابعد جدیدیت کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی یہ دوسری مرتب کردہ کتاب ہے۔ پہلی کتاب میں انہوں نے وہ مقالات جمع کیے جن میں مابعد جدیدیت کے تعقلات کو زیرِ بحث لایا گیا تھا۔ زیرِ نظر کتاب میں ایسے مقالات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جن میں مقالہ نگاروں نے متن کھولنے کے لیے مابعد جدیدیت کی فکری رَو کو بروئے کار لانے کی سعی کی ہے۔ مابعد جدیدیت ایک خود رَو فکری نشاۃ الثانیہ ہے جس نے اپنے عصر کی "روح" کو پیش کیا ہے۔ مابعد جدیدیت حمیت اور اصلیت کے بجائے اضافیت کی قائل ہے۔ وہ انسان اور فطرت، نیز ناظر اور منظور کی ثنویت کو قبول نہیں کرتی۔ حد بندیوں اور نظری سرحدوں کو مسترد کرنے کے ساتھ ساتھ ناقابلِ تغیر 'جوہر' کے بجائے تغیر پذیر صورتِ حال کا اقرار کرتی ہے۔ حدیہ کہ زماں کے تسلسل کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی جگہ وہ عدم تسلسل یعنی Discontinuity کا پرچار کرتی ہے۔ علاوہ ازیں

وہ ہر شے کی تعمیر میں خرابی کی صورت دکھاتی اور معنی کے مسلسل التوا کو نشان زد کرتی ہے۔ اردو ناقدین نے جب اپنے مقالات میں مابعد جدیدیت کے مہیا کردہ اس منظر نامے کے حوالے سے متن کی کنہ میں جھانکنے کی کوشش کی ہے تو گویا مابعد جدیدیت کے تعقلات سے مدد لی ہے۔

ناصر عباس نیر قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ان مقالات کو مرتب کر کے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی ضرورت جامعات میں ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔

....

نام کتاب: سُرخاب / مرتب: علی ثار / صفحات: 160 / قیمت: 350 روپے / تبصرہ نگار: محمد ابصار

ناشر: اہلِ ذوق پبلشرز، اُردو بازار، لاہور

اردو اصناف میں صنفِ افسانہ اپنی مثال آپ ہے۔ افسانہ لکھنا جتنا آسان ہے اُتنا ہی مشکل بھی ہے، ایک افسانے میں واقعے کا قیام، کرداروں کی پختگی اور خارجی کیفیات انتہائی اہمیت رکھتے ہیں، جن کا نباہ ہر ایک لکھاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور جب میں سُرخاب کو دیکھتا ہوں تو یہ خیال گزرتا ہے کہ صاحبِ سُرخاب کی پسند، مطالعہ اور مزاج، روایت اور جدت کا حسین امتزاج لیے ہوئے ہے۔ الغرض "سُرخاب" زندگی کی مختلف کیفیات ہیں، کہیں اس میں "دیمک" لگنے کا ذکر ہے تو کسی موڑ پر "دلدل" بانہیں کھولے پڑی ہے، کہیں "درد کے خیمے" لگے ہیں تو کہیں "کاسے کہوں؟" جیسے مشکل سوالات موجود ہیں، مگر اس سب کے باوجود یہ زندگی "دھنک رنگ زندگی" ہی کہلاتی ہے، اور کتاب کا اختتام اسی محاورے پر ہے۔

علی ثار (کینیڈا) نئی صدی کے افسانوی انتخاب "سُرخاب" پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

....

نام کتاب: جی بسم اللہ / مصنف: ڈاکٹر اختر شمار / صفحات: 166 / قیمت: 500 روپے / فلیپ نگار: ڈاکٹر صفدر محمود

ناشر: نیوبک سائیٹ، ۵۷۔ بی۔ ٹرائیکون ویلج نزد، بحریہ ٹاؤن، کینال روڈ، لاہور۔

ڈاکٹر اختر شمار کا شمار پاکستان کے معروف دانشوروں، ادیبوں اور کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان کی تحریروں پر رائے دینے کا اہل نہیں، لیکن اگر کوئی لفظ، پیرا یا مضمون انسان کے دل میں اتر جائے تو الفاظ خود بخود اندر سے نکلنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر شمار کے یہ منتخب کالم پڑھتے ہوئے کچھ ایسی ہی واردات مجھ پر بیت گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کی تحریروں پر تصوف اور روحانیت کا رنگ نمایاں ہے اور اُن میں ابدی سچائیاں جھلکتی ہیں، جو بہر حال انسان کو متاثر کرتی ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تصوف، صوفیانہ رنگ اور روحانی تحریریں روح کی پیاس بجھاتی ہیں۔ شاید ان سے میری روحانی تشنگی کم ہوئی، اس لئے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر روح پر انا اور نفس کا زنگ اور گرد جم نہ جائے تو اسے تشنگی کا احساس رہتا ہے ورنہ وہ احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تب بندہ نفس کا مکمل غلام بن کر رہ جاتا ہے اور دن رات خواہشات کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے۔

ڈاکٹر اختر شمار کی بعض تحریریں انتباہ کا درجہ رکھتی ہیں اور انسان کو خود احتسابی پر مائل کرتی ہیں۔

یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک خود صاحبِ تحریر کے اندر کسی کی نظر کی "جاگ" نہ لگی ہو۔

میں ڈاکٹر صاحب سے کبھی ملا نہیں لیکن لگتا ہے اس "جاگ" نے ڈاکٹر صاحب کو جگا دیا ہے اور وہ اپنی جاگتی آنکھوں سے "وہ کچھ" دیکھ رہے ہیں جو ان کے ہم عصر دیکھنے اور محسوس کرنے سے عاری ہیں۔

....

ناقدین نے ناصر کاظمی کی نسبت احمد مشتاق کو وہ توجہ نہیں دی جس کے وہ حقدار تھے

میرے نزدیک لکھنے کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے ورنہ آپ کی تخلیق جمود کا شکار ہو جائے گی

ناروے میں مقیم ممتاز شاعر ارشد شاہین سے حسن عباسی کی گفتگو

حسن عباسی: شعر و ادب سے وابستگی کیسے ہوئی؟

ارشد شاہین: کسی بھی تخلیق کار کو تخلیقی صلاحیت قدرت کی طرف سے پیدائشی طور پر ودیعت ہوتی ہے البتہ اس پر اس کا انکشاف کسی مخصوص وقت میں ہوتا ہے اور مجھ پر اس بات کا انکشاف سولہ سترہ برس کی عمر میں کالج کے زمانے میں ہوا جو گورنمنٹ کالج جی ٹی روڈ جہلم کی ادبی فضا کا مرہونِ منت ہے۔ فرسٹ ایئر میں زندگی کا پہلا شعر کہا جو درج ذیل ہے۔

پت جھڑ کی سرد ہواؤں میں مجھ کو بھی جھڑنا پڑتا ہے
ہر روز قیامت ہوتی ہے ہر روز بچھڑنا پڑتا ہے

ابتدائی طور پر اپنے اردو کے استاد اور کہنہ مشق شاعر جناب مکرم حسین خورشید سے اصلاح لی۔ علاوہ ازیں کالج میں موجود اردو اور پنجابی کے صاحبانِ طرز شعرا جناب باغ حسین کمال مرحوم اور امین طرب صدیقی مرحوم نے میرے اس شوق کی نشوونما میں نمایاں کردار ادا کیا۔ چند برس تک یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ 1994 میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا جو اس زمانے میں بہت سے نامور شعرا اور ادبا کی آماجگاہ تھا جس سے مجھے ایک خالص ادبی ماحول میں اپنے شوق کو پروان چڑھانے کے بھرپور مواقع میسر آئے۔ ایف سی کالج کے اساتذہ اور وہاں کی آئیڈیل ادبی فضا نے میرے شوق کو نکھارنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ پاک ٹی ہاؤس لاہور کے قریب ایف

سی کالج کے ہاسٹل ٹیپو ہال واقع نیلا گنبد میں رہائش پذیر ہونے کے باعث حلقہ ارباب ذوق اور دیگر ادبی تنظیموں

وطن سے دوری کا احساس شاعری کو مہمیز عطا کرتا ہے

کی ادبی تقریبات میں شمولیت کا بھرپور موقع ملا جس کے ذریعے میرے شعری و ادبی ذوق کی تربیت ہوتی رہی اور سینئر شعرا و ادبا کی صحبت میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

حسن عباسی: روایت اور جدت میں کون سے ادب کو زندگی کا صحیح ترجمان سمجھتے ہیں؟

ارشد شاہین: روایت ہو یا جدت وہی ادب زندگی کا صحیح ترجمان ہے جس میں حقیقی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور مسائل کو زیرِ بحث لایا جائے۔ روایت اور جدت باہم لازم و ملزوم ہیں۔ روایت سے کٹ کر جدت کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کہ بغیر بنیاد کے عمارت۔ خلا میں تعمیر قلعے خوب صورت اور جاذبِ نظر تو ہو سکتے ہیں مگر پائیدار نہیں۔ اس سلسلے میں میرا ایک شعر بھی ہے۔

نہیں بنیاد بن کوئی عمارت
روایت بن کوئی جدت نہیں ہے

حسن عباسی: آپ حلقہ ارباب ذوق کے سرگرم رکن رہے ہیں اور کئی بار اس کا الیکشن بھی لڑ چکے ہیں۔ اس کی دو حصوں میں تقسیم کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ارشد شاہین: حلقہ ارباب ذوق تاریخی اہمیت کا حامل ایک موقر حلقہ ہے جو شعر و ادب کی ترویج و ترقی کا ضامن ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی یہ دو حصوں

بقیہ اندرونی صفحات پر

سرکٹ ہاؤس میں شعیب الرحمٰن ادبی فورم اور میڈیا ہاؤس خانیوال کے زیرِ اہتمام

عامر بن علی کے اعزاز میں

''شامِ پذیرائی وعشائیہ''

تقریب کے شرکاء کا گروپ فوٹو

اس موقع پر جہانزیب خان DPO کے خانیوال میں ایک سال مکمل ہونے کا کیک بھی کاٹا گیا ADC چوہدری اشفاق اور AC عابد بھی نمایاں ہیں

تقریب کا ایک خوبصورت منظر

معروف صحافی توفیق بٹ کی خصوصی شرکت نے محفل کو مزید گرما دیا۔

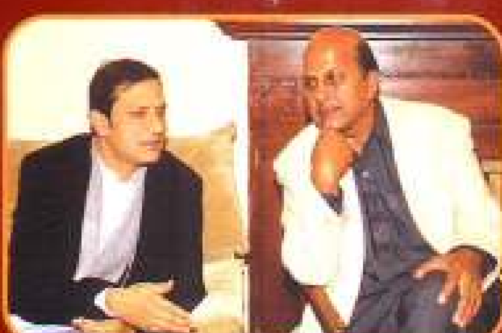

پریس کلب کے سابق صدر طاہر تبسم اور عامر بن علی گفتگو

Design By:
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com